اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار
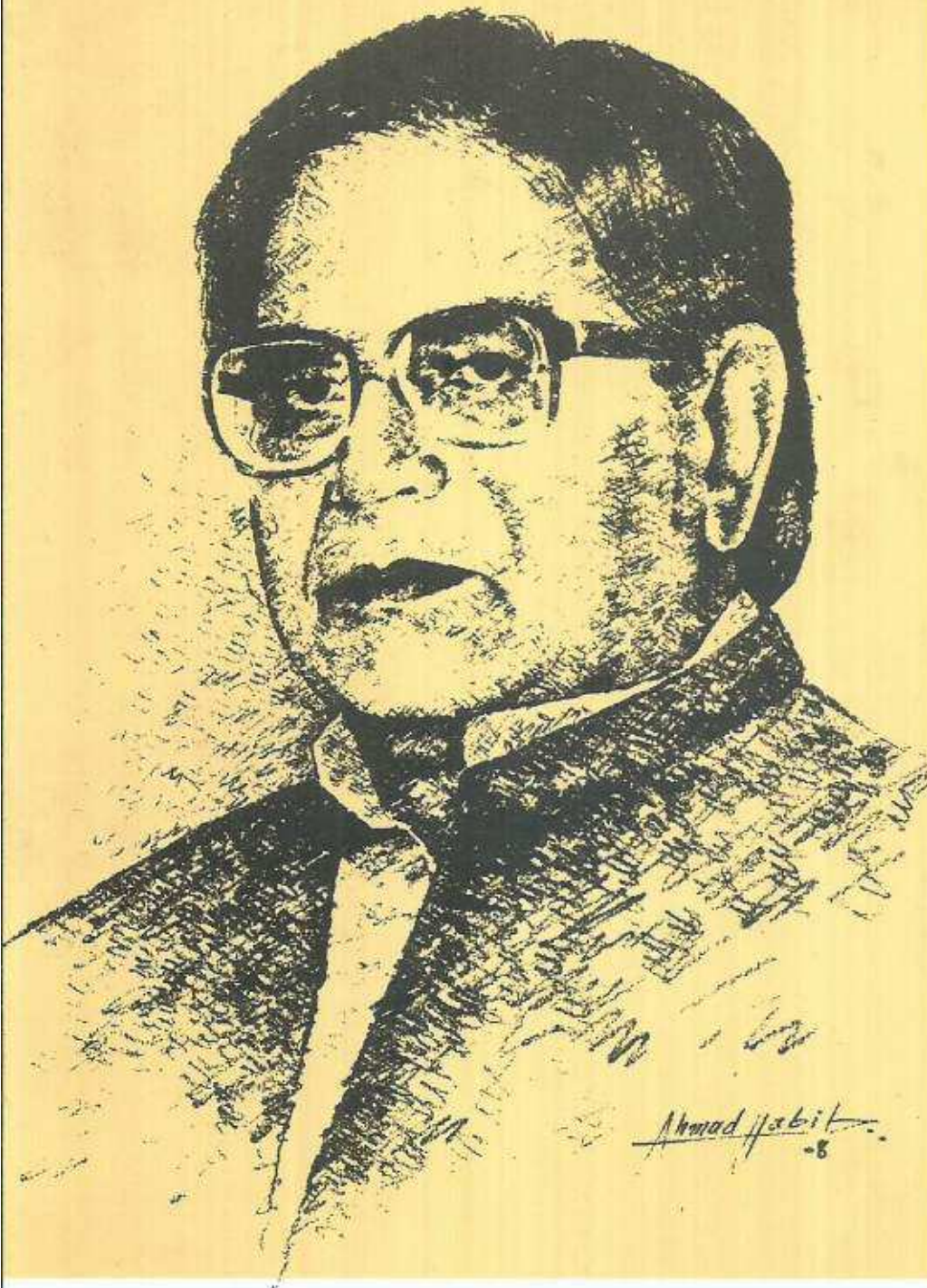
افتخار عارف: شخصیت اور فن

عبدالعزیز ساحر

پاکستانی ادب کے معمار

افتخار عارف
شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

افتخار عارف
شخصیت اور فن

عبدالعزیز ساحر

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	:	فخر زمان
منتظم	:	خالد اقبال یاسر
تدوین و طباعت	:	سعیدہ درانی
اشاعت	:	2009
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	ماریہ پرنٹرز، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: -/275 روپے غیر مجلد: -/250 روپے

ISBN: 978-969-472-170-5

Pakistani Adab Ke Mamar

"Iftikhar Arif : Shakhseyat our Fun"

Compiled By

Abdul Aziz Sahir

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad,Pakistan

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی زبانوں میں ہمارے مشاہیر نے پاکستانی ادب کے حوالے سے جو کام کیا ہے کسی بھی بین الاقوامی ادب کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان مشاہیر کے علمی وادبی کام اور اُن کی حیات کے بارے میں معلومات کو کتابی صورت میں لانے کے لیے پاکستانی ادب کے معمار کے نام سے اشاعتی منصوبہ شروع کیا ہے جس کے تحت پاکستانی زبانوں کے مشاہیر پر کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔

افتخار عارف ہمارے عہد کے معروف اور ممتاز شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے فن سے اپنی ایک علیحدہ شناخت قائم کی ہے۔ نظم اور غزل دونوں میں اپنے مخصوص انداز کی بنا پر وہ پہچانے جاتے ہیں۔ اپنے زمانے میں معاشرے اور اپنی تہذیب سے ان کا رشتہ گہرا اور مضبوط ہے اس کتاب کے مصنف نے افتخار عارف اور ان کے فن کو مختلف پہلوؤں کے ساتھ سمجھنے کی اچھی کوشش کی ہے۔

اس اشاعتی منصوبے کی پیش نظر کتاب ''افتخار عارف: شخصیت اور فن'' اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر معروف نقاد، محقق اور ادیب عبدالعزیز ساحر صاحب نے تالیف کی ہے۔ اس کتاب سے یقیناً اہل ادب اور عام قاری، افتخار عارف کی شخصیت اور فن سے بہتر طور پر آگاہ ہو سکیں گے۔

یہ کتاب افتخار عارف کے بارے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت کی حامل ہے۔ امید ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے ''پاکستانی ادب کے معمار'' سلسلے کی کتاب ''افتخار عارف: شخصیت اور فن'' کو ملک اور بیرون ملک یقیناً پسند کیا جائے گا۔

فخر زمان

پیش لفظ

افتخار عارف ہمارے معاصر ادبی اور فکری منظرنامے کا اہم ترین نام ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ کبھی کبھار وہ نثر کی وادی میں بھی جلوہ گر ہوئے، مگر ان کا اصل میدان شاعری رہا۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں ہماری دینی، تہذیبی اور فکری زندگی کے اتنے رنگ اور رس موجود ہیں کہ ان کا کلام بیک وقت ہمارے تابناک ماضی کی روایت کا امین بھی ہے اور لمحۂ موجود میں ہمارے عصری رویوں کا ترجمان بھی۔ خواب، خیال اور خاک کے استعاراتی فن کدے میں نمو پذیر ہوتی ان کی شاعری مدینہ و نجف و کربلا کے منظروں اور موسموں کی آئینہ دار ہے۔ ان کی علامتیں، استعارے اور امیجز (Images) ہمارے ماضی کی تہذیبی زندگی اور ہمارے خوابوں کی سرزمینوں سے پھوٹتے ہیں۔ ان کا تہذیبی شعور اس صداقتِ احساس سے منعکس ہوتا ہے، جو ہمارے عقائد، تہذیب اور ثقافت سے وابستہ ہے۔

خواب اور خیال کے استعاراتی تناظر میں خاک کی فکری جمالیات اپنی تہذیبی معنویت میں فکر و خیال کے جو دریچے وا کرتی ہے، ان کا تعلق مابعد الطبیعیاتی شعور سے بھی وابستہ ہے اور زندگی کے مادی اور خارجی رویوں کے ساتھ بھی۔ .... خاک کے استعاراتی رنگ کہیں سیاسی اور سماجی مسائل کی گرہ کشائی کرتے ہیں، تو کہیں ان کا سلسلۂ خیال: عرفان و یقین کے دائرہ در دائرہ پھیلتے ہوئے منظروں سے مل جاتا ہے اور اس طرح خاک کا لفظ: معانی کا گنجینۂ اسرار بن کر سامنے آتا ہے اور افتخار عارف کی غزل میں اس لفظ کی استعاراتی اپیل: رنگ اور خوشبو کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ یہ رنگ کہیں تو سلسلۂ فکر و خیال کے آتشیں لبادے میں ملبوس ہو کر اظہار کی راہ پاتے ہیں اور کہیں ان کی نمود میں جمالیاتی آہنگ کا امتزاجی پہلو شامل ہو کر انھیں مٹی کے رنگ کا نقیب

بنا دیتا ہے اور یوں خاک بے رنگی کے منظر نامے سے نیرنگی کے رنگ کشید کرنے لگتی ہے۔

میرے لیے انتہائی خوشی کی بات ہے کہ افتخار عارف کی فکری اور ادبی جہات پر مجھے کام کرنے اور ان کے کلام کو بار بار پڑھنے کی سعادت میّسر آئی۔ ان کی شخصیت اور کلام میں ایک ایسا رنگ، ایک ایسی موہنی، ایک ایسی خوش بو ہے، جو انکسارِ ذات سے پھوٹتی اور اثباتِ وجود کے چمنستان میں برگ وبار لاتی ہے۔ بہ قولِ شاعر:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ
آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں، مگر ایسے بھی ہیں

عبدالعزیز ساحر

ہے کنجِ شہرِ وفا میں سحاب جیسا شخص

”افتخار عارف :سوانحی خاکہ“

نام: افتخار حسین

”قرۃ العین حیدر نے گردشِ رنگِ چمن میں ایک بزرگ سلطان محمد عارفؒ کا ذکر کیا ہے۔ ان کے تذکرے کا آغاز افتخار عارف کے مصرعے: غبارِ دشتِ طلب زیادہ ہے، تو جنوں میں زیادہ ہوجا........ سے ہوتا ہے۔ حضرت سلطان محمد عارفؒ کے نام پر افتخار عارف نام رکھا گیا تھا۔ جب افتخار عارف نے شعور کی ابتدائی منزلیں طے کیں، تو افتخار حسین عارف لکھنا شروع کر دیا، حتیٰ کہ ساتویں جماعت میں ان کی پہلی غزل اسی نام سے شائع ہوئی۔ یونیورسٹی آف لکھنؤ سے جاری ہونے والی بی اے اور ایم اے کی اسناد پر افتخار حسین اور میرٹ سرٹیفکیٹس پر افتخار حسین عارف درج ہے۔“(۱)

قلمی نام: افتخار عارف

ادب کی دنیا میں انہوں نے اپنے قلمی نام افتخار عارف سے لکھنا شروع کیا۔

پس منظر

''افتخار عارف کے والدِ گرامی کا نام بی پی بخش اور والدہ محترمہ کا نام آمنہ خاتون ہے۔''(۲)

''افتخار عارف کا تعلق ایک متوسط مذہبی گھرانے سے ہے۔ان کے سلسلے کے بزرگ بابا مہر علی شاہؒ ہیں:

سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہؒ

بابا ! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

''افتخار عارف کی والدہ محترمہ حضرت سلطان محمد عارفؒ کے والدمحترم حضرت دانش علیؒ سے بیعت تھیں۔ جنہیں ہندوستان میں ''بھیا'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔وہ مخدوم شیخ سارنگؒ کے سجادہ نشین ہیں۔ ہندوستان کی ممتاز اور معروف ناول نگار، افسانہ نگار قرۃ العین حیدر بھی ان سے بیعت تھیں۔

انہیں بزرگ ہستیوں سے قلبی لگاؤ کی وجہ سے افتخار عارف کی زندگی اور شاعری میں تصوف کا گہرا میلان نظر آتا ہے۔''(۳)

''میرے خاندان میں دونوں مسلک کے لوگ تھے۔اہلِ سنت اور اہلِ تشیع بھی تھے، اس طرح میں محفلوں میں بھی شریک ہوا اور مجلسوں میں بھی چلا جاتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ میں دونوں طرف کی چیزیں اخذ کرنے لگا۔میرے اندر تعصب یا تنگ نظری کی بجائے رواداری اور افہام و تفہیم کے جذبات بیدار ہونے لگے۔اسی طرح میرے گھر کے قریب ہی دو بڑی خانقاہیں تھیں۔ ان میں ایک خانقاہ سلسلہ عالیہ چشتیہ کے بہت بڑے بزرگ مخدوم قطبِ عالم حضرت شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، جن کے نام سے ایک زمانہ واقف ہے۔ان کے ماننے والوں کو مینائی کہتے ہیں۔وہاں سماع کی

محفلیں اکثر ہوا کرتی تھیں، اسی طرح جہاں میں رہتا تھا، وہاں حضرت عبدالرحمٰن سندھیؒ کی خانقاہ تھی، جو بابائے ہند کہلاتے تھے۔'' (۴)

افتخار عارف اپنے نانا کے بے حد لاڈلے تھے۔ ان کی پرورش میں ان کے والدین سے زیادہ تر نانا کا بہت عمل دخل ہے، وہ میں لکھنؤ میں رہتے تھے، اس لیے افتخار عارف زیادہ تر ان کے پاس ہی رہتے تھے۔'' (۵)

افتخار عارف کہتے ہیں:

مجھے کتاب سے محبت میرے نانا کی طرف سے ملی، جنھیں میں بابا کہتا تھا انھوں نے میرے اندر علم اور کتاب کی اہمیت اور فضیلت راسخ کر دی تھی۔ وہ کوئی زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے، لیکن ان کا کتاب سے رشتہ بہت گہرا تھا۔'' (۶)

آبائی شہر

''میرا آبائی شہر لکھنؤ ہے۔ (۷) میں ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوا ہوں، لیکن میرے کاغذات میں ایک سال آ گے، یعنی ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں اسکول میں داخلے کے لیے پہلے امتحان ہوتا تھا اور لکھنؤ کے جو اچھے اسکول تھے، ان میں جوبلی اسکول کا شمار بھی ہوتا تھا، جہاں داخلے کے لیے ہمارے استاد حسن نقوی صاحب مجھے لے گئے۔ اس وقت میں چوتھی میں تھا اور چھٹی جماعت میں داخلے کے امتحان میں اپیئر کروانے کے لیے لے گئے، لیکن اسکول کے ضابطوں کے مطابق میری عمر اتنی نہیں تھی کہ مجھے داخلہ ملتا، سو انھوں نے میری عمر ایک سال بڑھا کر ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کر دی اور وہی تاریخ آج تک میری تعلیمی اسناد اور باقی کاغذات میں چلی آ رہی ہے۔'' (۸)

ماحول:

''بچپن کا لکھنؤ ادبی اور تہذیبی اعتبار سے بہت اہم تھا۔ برِ صغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کے بعد جہاں مسلم تہذیب کسی نہ کسی شکل میں بچ رہی اور بنیادی نوعیت سے بہ لحاظِ اقلیت مسلم شناخت پر اصرار کرتی رہی، اس میں لکھنؤ کو ان شہروں میں مرکزیت حاصل تھی، جو مسلم اقلیت میں ہونے کے باوجود علاحدہ پہچانے جاتے تھے۔ یہ لکھنؤ: مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور علامہ سیّد علی نقی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کا لکھنؤ تھا؛ یہ پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب، پروفیسر احتشام حسین اور نیاز فتح پوری کا لکھنؤ تھا؛ یہ جوش، جعفر علی اثر، یگانہ، آرزو، مجاز، علی عباس حسینی، سبطِ حسن اور سردار جعفری کا لکھنؤ تھا۔ ان میں وہ افراد بھی تھے، جو خالص اسلامی نقطۂ نظر کے حامی تھے اور وہ بھی کہ جنھیں سیکولر نظریات کا حامی قرار دیا جاتا تھا اور بعض کے خیالات خالصتاً کیمونسٹ تھے، مثلاً: سیّد سجاد ظہیر، زین العابدین امجد۔ اس فضا میں گزرا ہوا بچپن، بھانت بھانت کی لہروں سے گزرتا اور اثرات کے رد و اخذ و قبول سے گزرتا ہے۔''(۹)

بچپن کے مشاغل:

''بچپن میں سب بچوں کی طرح کھیل کود میں لگا رہتا تھا، مگر لکھنے پڑھنے اور خاص طور پر تاریخ اور شاعری پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ خلفائے راشدین کے عہد کی تاریخ، بنو امیہ اور بنو عباس کے دور کی تاریخیں، مسلمانانِ برِ صغیر کے مختلف ادوار کی تاریخیں میں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ

شاعری کی فضا اور بیت بازی کے ادارے کے سبب غزل سے ربط قائم کرلیا تھا، جو زندگی بھر کا ساتھ بن کر آج بھی ویسا ہی باقی ہے۔ بچپن کے بارے میں ایک چھوٹی سی نظم میں کہیں میں نے لکھا ہے:

بچپن کی گلیوں میں جن جن گھروں کے شیشے میری گیند سے ٹوٹے تھے
ان سب کی کرچیں کبھی کبھی میری آنکھوں میں چبھنے لگتی ہیں
جلتی دوپہروں میں میرے ہاتھوں اُجڑے ہوئے گھونسلوں کے
بے حال پرندوں کی چیخیں، فریادیں
میری بے گھر شاموں میں کہرام مچاتی رہتی ہیں
ایک حشر اٹھاتی رہتی ہیں''(۱۰)

''ایک 'آنہ لائبریری' محلے میں تھی، وہاں بھی مجھے ایک آنے کے بدلے دن بھر پڑھنے کو ایک کتاب مل جاتی تھی۔ تاریخ سے شغف اسی زمانے کا قصہ ہے۔ عبدالحلیم شرر اور صادق حسین سردھنوی کے اسلامی تاریخی ناول اس زمانے میں بہت پڑھے جاتے تھے۔''(۱۱)

اپنی یونیورسٹی اور مطالعے کے شوق کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:
''جب میں رات کے وقت پڑھا کرتا تھا تو ہمارے یہاں بجلی ابھی نہیں آئی تھی، لالٹین کی روشنی پڑھتا تھا۔ بارہ ایک بجے تک تیل ختم ہو جاتا تھا تو جو کچھ اس وقت پڑھا ہوتا میں اسے ذہن میں تازہ کرتا رہتا تھا اور پھر اگلے دن یونیورسٹی کے پیدل سفر میں بھی اسے دہراتا جاتا۔ دیر تک لائبریری میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی شہر کی لائبریری میں شیلفوں کے حساب سے کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتا تھا کہ ان چھٹیوں میں فلاں شیلف ختم کرنی ہے۔''(۱۲)

اس طرح ان کا مطالعہ اور حافظہ بہت وسیع ہوتا گیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ افتخار عارف کا حافظہ غیر معمولی طور پر انتہائی قوی ہو گیا۔ جس کا انہیں آنے والے وقت میں بہت فائدہ ہوا۔ آج بھی ان کا حافظہ دیکھ کر واد دینی پڑتی ہے۔ عمر کے اس حصے میں جب کہ ہر عکس دھندلا پڑنے لگتا ہے اور چیزیں بھولنا شروع ہو جاتی ہیں۔ افتخار عارف کا حافظہ آج بھی زبردست ہے۔

افتخار عارف کا کہنا ہے:

خداوند کریم نے اس دور کی مشکلات کو میری زندگی کی بنیاد بنایا اور مجھے جو حافظے کی صلاحیت دی تھی اس کی تربیت ہوتی گئی۔ اس میں اضافہ ہوتا گیا، استعداد حفظ بڑھتی گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایسا وقت آیا کہ ہر دیے جانے والے لیکچر کو میرا ذہن محفوظ کرتا چلا جاتا تھا۔ آج بھی جب کوئی کتاب پڑھ رہا ہوتا ہوں تو شعوری طور پر کچھ چیزیں ذہن نشین کرتا چلا جاتا ہوں۔" (۱۳)

"ان کا بچپن بیک وقت مذہبی اور ادبی محفلوں کے زیر سایہ گزرا۔ انہیں بچپن سے ہی ادب اور مذہب سے بے پناہ لگاؤ تھا اور انہیں ہزاروں کی تعداد میں اشعار یاد ہوتے تھے، جنہیں وہ بیت بازی کے وقت مختلف مقابلوں میں آزماتے رہتے تھے۔" (۱۴)

تعلیم

''افتخار عارف نے بڑے جلیل القدر اساتذہ کے زیرنگرانی تعلیم حاصل کی انہیں اپنے اساتذہ سے بڑی محبت اور لگاؤ تھا۔ان اساتذہ کے زیرنگرانی افتخار عارف کا جوہر اپنے کمال کو پہنچا اور وہ باعث افتخار بنے۔'' (۱۵)

''افتخار عارف نے بہت کم عمری میں قرآنِ مجید محلے کی مسجد میں مولوی حافظ محمد حسین سے پڑھا۔جبکہ قران پاک کا کچھ حصہ مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں پڑھا۔'' (۱۶)

''مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل، لکھنؤ افتخار عارف کی ابتدائی درسگاہ ہے۔ بلاتفریق اس مدرسے میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ تحصیل علم کرتے تھے۔امام بخش ناسخ جیسی سخنور شخصیت نے بھی اسی درسگاہ سے کسب فیض کیا چوتھی جماعت تک افتخار عارف اسی مدرسے میں پڑھتے رہے اور پھر پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرنے بعد چھٹی جماعت میں لکھنؤ کے جوبلی اسکول میں داخل ہو گئے۔

جوبلی اسکول، لکھنؤ سے میٹرک پاس کیا جہاں ان کو حامد اللہ افسر میرٹھی اور علی عباس جیسے اساتذہ سے فیض یاب ہونے کے مواقع ملے۔

جوبلی کالج، لکھنؤ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔'' (۱۷)

''بی اے کا امتحان یونیورسٹی آف لکھنؤ سے سوشیالوجی ،سوشل ورک، اردو جنرل سنسکرت اور جنرل انگلش کے مضامین کے ساتھ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۲ء میں

پاس کیا۔"(۱۸)

"یونیورسٹی آف لکھنؤ سے ۱۹۶۵ء کے کانووکیشن میں افتخار عارف کو ایم۔اے سوشیالوجی کی ڈگری عطا کی گئی۔

انہوں نے یونیورسٹی آف لکھنؤ سے ایم اے ایس کا امتحان بھی پاس کیا۔"(۱۹)

"انہوں نے کولمبیا یونی ورسٹی، نیویارک سے میڈیا مینجمنٹ مختصر کورس کیا۔"(۲۰)

اساتذہ

"ان کے اساتذہ میں حسن نقوی، رضوان علی، اختر علی تلہری، علامہ سیّد علی نقوی، پروفیسر مکرجی، غلام مصطفیٰ علوی، ڈاکٹر شبیہ الحسن، پروفیسر احتشام حسین، مولوی محمد حسین، علی عباس حسینی اور حامد اللہ افسر میرٹھی شامل ہیں۔"(۲۱)

شاعری کا آغاز

''شعر تو میں بچپن سے کہہ لیتا تھا، مگر اس کو آپ سمجھیے کہ ایک طرح کی موزوں طبعی تھی۔ بیت بازی کے لیے ہزاروں شعرا اساتذہ سے لے کر اپنے عہد تک کے شعرا کے یاد تھے۔ ایسی صورت میں خود بہ خود آدمی وزن سے اور بحر سے، ردیف اور قافیے وغیرہ کے ابتدائی مسائل سے واقف ہو جاتا ہے، مگر اصل شاعری میرے نزدیک کچھ اور ہوتی ہے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں میگزینوں میں میرا کلام شائع ہوا تھا۔ 'طالب علم درجہ ہفتم' کے عہد کی ایک میگزین میرے ریکارڈ میں ہے، جس میں میری ایک نہایت پھیکی غزل شائع ہوئی ہے۔ میرے اساتذہ کہتے تھے کہ اور طالب علم یا تو بزرگوں سے لکھوا کے لے آتے تھے یا پھر اصلاح وغیرہ کے بعد شائع کراتے تھے۔ میں نے اپنی بوگس غزل خود لکھی تھی اور اصلاح کے بغیر دی تھی، سو وہ چھاپ دی گئی۔ یونی ورسٹی کے زمانے میں بھی مشاعروں اور شعر گوئی کے مقابلوں میں، میں شعر پڑھتا رہتا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد بھی کراچی میں نجی نشستوں میں شریک ہوتا تھا، مگر میرے بزرگوں کے ایک گروہ نے خاص طور پر میری توجہ اس طرف مرکوز کرائی۔'' (۲۲)

''میرے استاد سیّد محمد عارف نے مجھے اس غزل کے بارے میں بتایا کہ

افتخار عارف! جب آپ کی غزل آئی، تو وقار احمد ظفر صاحب نے کہا کہ افتخار عارف کی غزل دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں کمزور ہے، جس پر میں نے (سیّد محمد احمد) ان سے کہا: جی ہاں! افتخار اور دوسرے لوگوں کی غزل میں یہ فرق ہے کہ دوسرے لڑکے اپنے گھر میں کسی چچا یا ماموں سے غزل لکھوا کر لائے ہیں، جب کہ افتخار عارف نے اپنی غزل خود لکھی ہے، اس لیے یہ ضرور چھپنی چاہیے۔ چناں چہ پھر وہ غزل چھپ گئی۔" (۲۳)

"میں نے پہلے مشاعرے میں نصیر ترابی کے ساتھ شرکت کی۔" (۲۴)

پاکستان آمد

"جہاں تک میرا تعلق ہے، پاکستان میرا انتخاب تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ میرا افتخار بھی ہے۔ ایم اے کے امتحان کے نتائج کے شائع ہونے سے پہلے ہی میں ہجرت کے عمل سے گزر آیا تھا۔" (۲۵)

"پاکستان ہجرت میرا انتخاب تھا، مجبوری نہیں۔ میرے والدین اور نانا حیات تھے، میرے بہت سے قریبی ددھیالی اور ننھیالی رشتہ دار اب بھی ہندوستان میں ہیں لیکن میں اکیلا پاکستان آیا تھا۔ مجھے اپنی مسلم شناخت پر فخر تھا، جو لوگ ہندوستان میں نہیں رہے، انھیں اندازہ نہیں ہے کہ پاکستان کتنی بڑی شناخت ہے۔" (۲۶)

شادی

افتخار عارف کی شادی ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں ان کی والدہ کی خالہ زاد بہن کی بیٹی ریحانہ سے کراچی میں انجام پائی۔ (۲۷)

اولاد

ان کی اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش نہایت عمدہ کی ہے۔

بیٹی: تطہیر فاطمہ جنہیں پیار سے گیتی کہا جاتا ہے، انہوں نے امپیریل کالج

لندن سے ایم ایس کی ہے۔ ان کی شادی کامران محمود سے ہوئی جن کا تعلق لاہور سے ہے۔ کامران اپنے خاندان کے ساتھ لندن میں ہی مقیم ہیں۔ وہ منک کارپوریشن (Minc Corporation) کے نام سے ایک کمپنی چلا رہے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں۔ بیٹی، زینب، بیٹا، اظہر محمود ہے۔ (۲۸)

''بیٹا: علی افتخار ہے جو لندن میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے۔
افتخار عارف کے بیٹے علی کی شادی کراچی میں کرن سے ہوئی ہے۔ ان کی ایک بڑی بیٹی ہے جس کا نام ام ابیہا ہے۔'' (۲۹)

علی افتخار کے ہاں حال ہی میں ایک اور بیٹی آمنہ پیدا ہوئی ہیں۔

''افتخار عارف اپنے بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں انہوں نے گیتی کے لیے ''مہر دو نیم'' میں کہا ہے:

''مالک! میری گڑیا کے سب رنگ سلامت رکھنا
مجھ کو ڈر لگتا ہے
کچے رنگ تو بارش کی ہلکی سی پھوار میں بہہ جاتے ہیں
ایک ذرا سی دھوپ پڑے تو اڑ جاتے ہیں
مالک! میری گڑیا کے سب رنگ سلامت رکھنا''

''مہر دو نیم'' میں غزل کا ایک شعر ہے:

گڑیوں سے کھیلتی ہوئی بچی کی آنکھ میں
آنسو بھی آگیا تو سمندر لگا ہمیں

افتخار عارف نے اپنے بیٹے کے لیے ''مہر دو نیم'' میں ایک نظم لکھی ہے:

ایک تھارا جا چھوٹا سا
علی افتخار کی ماں سے میں نے بتا دیا ہے کہ اپنے بیٹے کو

تتلیوں کے قریب جانے سے روکیے

اسے روکیے کہ پڑوسیوں کے گھروں میں جھولے پڑے ہوئے ہیں تو اس سے کیا

اسے کیا پڑی کہ کبوتروں کو بتائے کیسے ہوائیں اس کی پتنگ چھین کے لے گئیں

علی افتخار کی ماں سے میں نے بتا دیا ہے کہ اپنے بیٹے

کو تتلیوں کے قریب جانے سے روکیے

کہیں یوں نہ ہو کہ پھر ایک بار بھری بہار میں اعتبار کے سارے زخم مہک اُٹھیں

علی افتخار کی ماں سے میں نے بتا دیا ہے کہ اپنے بیٹے کو

تتلیوں کے قریب جانے سے روکیے

مہر دو نیم میں ان کی ایک غزل کا شعر ہے:

بیٹا گرا جو چھت سے پتنگوں کے پھیر میں

کل آسماں پتنگ کے برابر لگا ہمیں (۳۰)

ان کی نواسی زینب نظمیں لکھتیں ہیں۔ ان کی نظموں کی کتاب ''My Poems'' شائع ہو چکی ہے۔ دوسری کتاب ''Honey Heart'' زیر طبع ہے۔

نواسے اظہر محمود کی پیدائش پر افتخار عارف نے تین مصرعے کہے ہیں:

اچانک کیسے روشن ہو گئی رات میری

محمد ﷺ کے نواسے کی غلامی کے تصدق

میرے معبود نے آگے بڑھا دی بات میری (۳۱)

خواب

”زندگی کے آغازِ سفر سے عمر کی اس منزل تک آدمی سو طرح کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی آرزوئیں، اس کی تمنائیں ساری عمر اس کو بھگائے پھرتی ہیں۔ خواب بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن میں کھلونوں کی آرزو کرنے والا جوانی میں چاند ستاروں پر کمندیں ڈالنا چاہتا ہے اور جوانی میں کسی مقصود و مطلوب کے سفر پر نکلنے والا آخر آخر میں کسی اور منزل کا تعین کر دیتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو چکا ہے۔ جب میں بہت کم عمر تھا، اس اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہونا چاہتا تھا، جس میں میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ ذرا بڑا ہوا، تو درس و تدریس کی اہمیت کے ساتھ ساتھ شاعری اور مطالعہ کے لیے کتب کا حصول ترجیحات میں شامل ہو گیا۔ کتاب بچپن سے میری ترجیحِ اوّل رہی۔ موضوع بدلتے رہے، کتاب سے محبت وقت کے ساتھ ساتھ مستحکم ہوتی گئی۔ خاندانی رشتے، دوستانہ مراسم، دینوی مناصب زندگی میں بہت اہم رہے، مگر زندگی کا مرکز و محور صرف کتاب اور کتاب ہی تھی۔ سب خواب اور ساری امیدیں پوری نہیں ہوتیں، لیکن اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کا ہزار کرم کہ اس نے مجھے بہت نعمتیں عطا فرمائیں۔ میرے وسیلۂ رزق کے سارے راستے کتابوں سے ہو کر گزرتے رہے۔ میرا دل اور میرا دماغ دونوں تمام ہنگاموں کے باوجود پلٹ پلٹ کر کتاب ہی طرف آتے رہے۔“ (۳۲)

”ٹیچر ہمارا آئیڈیل تھے۔ ٹیچر بننا چاہتے تھے، نہیں بنے۔ پوچھو کہ ٹیچر بننے

کا خیال کیوں آیا، تو اس کی بہت سے وجوہات تھیں۔ سب سے بڑی وجہ وہ اساتذہ تھے، جن سے ہم نے براہِ راست یا بالواسطہ اکتسابِ فیض کیا۔ کیسے کیسے لوگ تھے، احتشام حسین، علی عباس حسینی، حامد اللہ افسر میرٹھی، آل احمد سرور، علامہ سیّد علی نقی، مسعود حسین ادیب، اختر علی تلہری، رضوان علوی، لوگ کیا تھے، مکتب ہائے فکر تھے۔ مل جل کر انھوں نے اپنے علم سے، اپنی آگہی سے؛ اپنے کمالِ ہنر سے ایسی فضا بنادی تھی کہ لکھنا پڑھنا زندگی کا آئیڈیل جاب تھا۔ یہی لگن ہم ہندوستان سے اپنے ساتھ لائے۔ پاکستان پہنچے، تو ہمارے دوست اور محسن یاور مہدی ریڈیو پاکستان والے اس معاملے میں سرگرم مددگار ہوئے۔ لیکچر شپ کے لیے مختلف کالجوں کے پھیرے شروع ہوئے۔ یونی ورسٹی سے لے کر ناظم آباد نمبر ۳ حسینی اسکول تک میں کوشش کی، کام نہیں بنا۔ آخر یاور مہدی ہمیں ریڈیو لے گئے۔"(۳۳)

ملازمت

(۱) ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۷ء: بیرونی نشریات (ریڈیو پاکستان)

(۲) ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۷ء: سینئر پروڈیوسر، سکرپٹس ایڈیٹر (پاکستان ٹیلی وژن)

(۳) ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۰ء: ایگزیکٹو تعلقاتِ عامہ، بنک آف کریڈٹ اینڈ کامرس، (بی سی سی آئی) لندن

(۴) ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۰ء: ایگزیکٹو، انچارج اردو مرکز، لندن

(۵) ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۵ء: ڈائریکٹر جنرل، اکادمی ادبیات پاکستان

(۶) ۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۰ء: صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

(۷) ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۷ء: ڈائریکٹر جنرل، فاؤنڈیشن برائے پاکستانی اہلِ علم و قلم

(۸) ۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۸ء: چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان

(۹) ۲۰۰۵ء: مینجنگ ڈائریکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن

(۱۰) ۲۰۰۹ء...... تا حال: صدر نشین، مقتدرہ قومی زبان

(۱) ۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۷ء : بیرونی نشریات (ریڈیو پاکستان)

''زندگی کی پہلی نوکری میں نے کراچی میں کی تھی۔'' (۳۴)

''ریڈیو پاکستان میں خبریں پڑھنے سے میرے میڈیا کے کیریئر کا آغاز ہوا۔'' (۳۵)

''اردو اور ہندی میں خبریں پڑھنی شروع کیں۔ وہیں آڈیشن کے وقت سے عبید اللہ بیگ، انعام صدیقی، مشہود احمد (شاہد احمد دہلوی مرحوم کے بیٹے) سے دوستی ہوئی۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ پہلے ہفتے میں دو تین دن نیوز بلٹن پڑھنے

کو ملتا تھا، پھر سلیم گیلانی صاحب نے خاص عنایت کی کہ دن بڑھا دیے، سات کر دیے۔ کسی نئے نیوز ریڈر کو ہفتے میں سات دن خبریں پڑھنے کا چانس ملنا، اس وقت بڑی اہم بات تھی؛ اہم اور تعجب انگیز۔'' (۳۶)

''جب میں ریڈیو پاکستان میں کام کرتا تھا، تو وہاں بیرونی نشریات کے شعبے میں ہمارے دو دوست اور محسن، عبیداللہ بیگ اور قریش پور بھی کام کرتے تھے۔ یہ دونوں جو شخصیتیں تھیں، میں ان کو اپنی زندگی کے محسنوں میں سمجھتا ہوں۔ ہم سب خبریں پڑھا کرتے تھے۔ میں اردو اور ہندی کی قریش پور فارسی کی خبریں پڑھتے اور عبیداللہ بیگ اردو اور ہندی دونوں کی نشریات کے شعبے سے متعلق تھے۔ خالی اوقات میں کسوٹی ان کی فراغت کا مشغلہ تھا۔ میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل سلیم گیلانی اس زمانے میں بیرونی نشریات کے شعبے سے وابستہ تھے۔

کسوٹی پروگرام

ملک میں جب ٹی وی آیا، تو سلیم گیلانی نے کسوٹی کا تعارف اسلم اظہر صاحب سے کرایا، جو اس زمانے میں پی ٹی وی کراچی کے جی ایم تھے۔ اسلم اظہر صاحب نے عبیداللہ بیگ اور قریش پور کا باقاعدہ امتحان لیا اور اسی دن سے کسوٹی کا آغاز ہو گیا۔ کسوٹی کے کئی ادوار ہوئے۔ شاید دس برس کا عرصہ ہوگا، جس میں یہ پروگرام چلتا رہا ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاید ہی کوئی ذہنی آزمائش کا پروگرام ایسا ہوگا، جو ٹی وی سکرین سے نکل کر گھروں اور ہمارے دفتروں کی زندگیوں میں شامل ہو گیا ہو۔ لوگ خود آپس میں کسوٹی کھیلتے رہتے تھے۔ جب میری عمر بائیس برس کی تھی، تب یہ پروگرام شروع ہوا تھا۔ اب میں عمر کے باسٹھ برس پورے کر

چکا ہوں، مگر شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا ہوگا کہ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی اس کا ذکر نہ کرتا ہو۔''(۳۷)

(۲) ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۷ء: سینئر پروڈیوسر، سکرپٹس ایڈیٹر (پاکستان ٹیلی وژن)

''میں ۲۳ برس کا بھی نہیں ہوا تھا، جب 'کسوٹی' کا پروگرام شروع ہوا۔ اللہ نے اس حوالے سے بہت عزت دی، پھر پاکستان ٹیلی وژن میں سینئر پروڈیوسر اور اسکرپٹس ایڈیٹر کے عہدے پر کام کرتا رہا۔ ۲۸ برس کی عمر میں اسکرپٹس ایڈیٹر گریڈ ۸ میں ہو گیا تھا۔''(۳۸)

(۳) ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۰ء: ایگزیکٹو تعلقاتِ عامہ، بنک آف کریڈٹ اینڈ کامرس، (بی سی سی آئی) لندن

''۱۹۷۷ء میں ملک سے باہر چلا گیا۔...... بی بی سی ٹیلی وژن اور ریڈیو سے بھی پروگرام کیے۔''(۳۹)

(۴) ۱۹۸۱ء تا ۱۹۹۰ء: ایگزیکٹو انچارج اردو مرکز، لندن

''اردو مرکز لندن میں، اپنی زندگی کے دس بارہ سال میں نے بہت جاں فشانی سے اور خوش دلی سے کام کیا۔ مشتاق احمد یوسفی، ابنِ حسن برنی اور آغا حسن عابدی کے مشوروں سے اردو مرکز لندن کا قیام عمل میں آیا۔ ہفتہ وار، ماہانہ ادبی جلسے، لیکچرز، مشاعرے، نشستیں، شامیں، تعارفی تقریبات، مطبوعات، لائبریری، مطالعاتی کمرہ اور ان میں شریک اور شامل اردو ادب کے وہ معتبر نام کہ جن کے سبب ممتاز مفتی لکھتے ہیں کہ اردو مرکز لندن ایک چھوٹا سا پاکستان تھا۔ اردو کے سبھی شاعر و ادیب یہاں جمع

ہو جاتے تھے۔ فیض سے تو ہمارا ادبی رشتہ بے حد مضبوط تھا۔ کراچی میں جب وہ عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل تھے؛ جب بیگم آمنہ مجید ملک کے پی ای سی ایم ایس کالج میں صادقین ان کے اشعار کی تصویر کشی کیا کرتے تھے، اس وقت ان کی محبت ہمیں حاصل تھی۔ ان کا رویہ ہمیشہ مشفقانہ اور محبت سے لبریز رہا۔ اردو مرکز کے لیے انھوں نے کہا:

رحمتِ حق سے جو اس سمت کبھی راہ ملے

سوئے جنت بھی براہِ رہِ جاناں چلیے

اردو مرکز کی منتظمی کے دوران ہمیں کن کن کی محبت اور رفاقت میسر آئی، وہ شخصیتیں بھولنے والی نہیں: زہرا آپا، گوپی چند نارنگ، پروین فنا سیّد، سیّد محمد تقی، جمیل الدین عالی، ضیاء فتح پوری، ضمیر صدیقی، شفیع عقیل، سلمٰی صدیقی، محمد علی صدیقی، قدرت اللہ شہاب، گیان چند، صالحہ عابد حسین، عبداللہ ملک، فارغ بخاری، خلیق انجم، ملک راج آنند، ممتاز حسین، منیب الرحمٰن، انور مقصود، قرۃ العین حیدر، نور الحسن جعفری، ادا جعفری، مسعود منور، فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، خمار بارہ بنکوی، خالد احمد، عطاء الحق قاسمی، حسن رضوی، آفتاب احمد، انتظار حسین اور کتنے ہی اور...... آپ نام لکھتے لکھتے تھک جائیں گے، لیکن سب کے نام ہمارے دل پر رقم ہیں، جو بھی وہاں قیام پذیر رہے یا پاکستان ہندوستان سے وہاں جاتے، اردو مرکز ان کی پذیرائی بہت خوشی سے کرتا اور شہر کی اجنبیت کا احساس کہیں دور رہ جاتا۔

اردو مرکز لندن کے قیام کو رالف رسل خوش آئند قرار دیتے ہوئے اس کے اغراض و مقاصد کی وسعت کا تعین بھی کرتے ہیں۔ وزیٹر بک میں وہ رقم طراز ہیں کہ اس کے مقاصد کے وسیع دائرے میں ان تمام کاموں کی گنجائش

ہے، جو برطانیہ کی اردو زبان اور ادب کی ترویج اور ترقی کے لیے کیے جا سکتے ہیں اور کیے جانے چاہییں۔ اردو مرکز کا ایک اہم مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس ملک میں اردو کے مسائل کو حل کرنے میں زیادہ سے زیادہ مدد کی جائے۔

انھوں نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ یہاں کے بیشتر تعلیمی اداروں کی تعلیم کا عمدہ انتظام کیا جائے اور وہ تمام مواد مہیا کیا جائے، جو اس کی پڑھائی کے لیے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ عام انگریز کو اردو زبان و ادب کی قدر و قیمت کا احساس دلایا جائے اور یہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے کہ جب اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب کے شہکاروں کے اچھے ترجمے شائع کیے جائیں۔ ان دونوں کاموں میں اردو مرکز بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے اور یہی اردو کی بڑی خدمت ہے۔" (۴۰)

"اردو مرکز صرف لندن کا اردو مرکز نہیں ہے، ایک طرح سے یہ عالمی اردو مرکز ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ دنیا بھر کے ان ملکوں کے لوگ، جنھیں اردو زبان و ادب سے دل چسپی ہے، لندن آتے ہیں، تو اردو مرکز میں حاضر ہونا ان کا فرض بن جاتا ہے۔ کسی بھی تہذیبی مرکز کی یہ کشش اور جاذبیت کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جن اصحاب نے اردو مرکز کے قیام کے بارے میں سوچا، وہ تو داد و ستائش کے مستحق ہیں ہی، مگر جس شخص نے اردو مرکز کو محبوبیت عطا کی، وہ افتخار عارف ہیں کہ شخصی اور فنی دونوں لحاظ سے دلآویز ہیں۔ انھی کی مساعی اور لگن کا نتیجہ ہے کہ اردو مرکز لندن، اردو زبان و ادب کا ایک مینارۂ نور بنا چار طرف جگمگاہٹیں بکھیر رہا ہے۔ اللہ برکت دے۔" (۴۱)

"اردو مرکز لندن میں ہمارے ادب اور ہماری ثقافت کا ایسا نخلستان ہے، جہاں آ کر واقعی ایک اجنبی کی مسافرت میں پیاس بجھ جاتی ہے۔ جس رفتار

سے یہ ترقی کرتا جا رہا ہے، خاص طور پر افتخار عارف جیسے ہر دل عزیز سربراہ
کی نگرانی میں...... اس سے مجھے یہ امید بندھتی ہے کہ ان شاء اللہ یہ ادارہ
مشرق کے لیے ایک عظیم مرکز بن کر رہے گا۔" (۴۲)

(۵) ۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۵ء : ڈائریکٹر جنرل اکادمی ادبیات پاکستان

۱۹۹۰ء میں اردو مرکز بند ہونے کے بعد افتخار عارف کو دوبارہ پاکستان آنا پڑا انہیں اکادمی ادبیات پاکستان کا ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ ملا۔

وہ ۱۹۹۵ء تک ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر رہے۔ اس دوران انہوں نے ادب کی ترقی اور ترویج کے بہت سے کام کیے۔ بہت سے نئے منصوبے شروع کیے گئے۔ اور رکے ہوئے کام دوبارہ شروع ہوئے۔

"بہت سے قابلِ ذکر کام میرے دور میں ہوئے، پاکستانی ادب انتخاب نثر
اور شاعری، کتابیات پاکستانی ادب۔ ان تین کتابوں کے علاوہ پاکستانی لٹریچر
کے نام سے ایک باقاعدہ انگریزی جریدے کا اجرا میری ایک بہت بڑی
کامیابی ہے۔ اس کے ذریعے میں نے دنیا بھر میں پاکستانی ادب کو متعارف
کرانے کی کوشش کی۔" (۴۳)

(۶) ۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۰ء: صدر نشین، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

(۷) ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۷ء: ڈائریکٹر جنرل، فاؤنڈیشن برائے پاکستانی اہلِ علم و قلم

(۸) ۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۸ء: چیئر مین، اکادمی ادبیات پاکستان

(۹) ۲۰۰۵ء : مینجنگ ڈائریکٹر، نیشنل بک فاؤنڈیشن

(۱۰) ۲۰۰۹ء...... تا حال: صدر نشین، مقتدرہ قومی زبان

مری زندگی میں بس اک کتاب ہے..........!

دوران ملازمت ان کی نگرانی میں شائع ہونے والی کتب

افتخار عارف کی زندگی میں کتاب کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی شخصیت کی ساخت پرداخت اور فکری و ذہنی ارتقا میں کتاب کی استعاراتی اپیل اساسی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ کتاب شناسی اور کتاب دوستی.......... افتخار عارف کی زندگی کا سرمایہ رہی ہے اور ہے۔ ان کی ذاتی زندگی سے لے کر منصبی زندگی تک کے تمام تر معاملات کتاب کے گرد.......... گردش کناں رہے ہیں۔ اردو مرکز لندن، اکادمی ادبیاتِ پاکستان اور مقتدرہ قومی زبان کے ساتھ اپنی منصبی مصروفیات کے دوران میں انھوں نے کتاب کی ترویج اور اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ متذکرہ اداروں کے ساتھ ان کی وابستگی کے زمانے میں، متنوع موضوعات پر مختلف ادبا وشعرا کی جو کتابیں منصہ شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔

اردو مرکز، لندن کی مطبوعات

اردو مرکز، لندن کے تحت "اردو ان گریٹ برٹن"، "اردو بکس ان دی انڈیا آفس لائبریری"، "کلیات میراجی"، "مشرق، یورپ میں اردو مخطوطات"، "اردو شاعری کا انتخاب" اور "ہسٹری آف اردو لینگویج اینڈ لٹریچر" شائع کیں۔

اردو مرکز، لندن میں سیمینار، کانفرنسیں، مشاعرے اور ثقافتی مظاہرے کا اہتمام بھی کیا جس میں دنیا کے نامور اہل قلم اور دانشور شریک ہوئے۔

اکادمی ادبیات پاکستان کی مطبوعات، بطور ڈائریکٹر جنرل

اکادمی ادبیات پاکستان کے ششماہی رسالہ ''Pakistani Literature'' کا آغاز کیا اور اس کے چار شمارے شائع ہوئے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے تحت پاکستانی ادب انتخاب (نثر) اور (شاعری) کے سالانہ انتخاب کا سلسلہ شروع کیا جس کے تحت ۱۹۹۰ تا ۱۹۹۴ تک کے انتخاب شائع ہوئے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے تحت کتابیات پاکستانی ادب کا سلسلہ شروع کیا جس کے تحت ۱۹۹۰ تا ۱۹۹۴ کتابیں شائع ہوئیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے تحت پاکستانی ادب کے معمار کے منصوبے کا آغاز کیا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے سہ ماہی ادبی مجلے ''ادبیات'' کے گیارہ شمارے بطور مدیر منتظم شائع ہوئے جن میں بلوچستان ادب نمبر، پنجابی / سرائیکی افسانہ نمبر، سندھی ادب نمبر، پشتو افسانہ نمبر، بلوچی / براہوئی افسانہ نمبر اور سالنامہ کا خصوصی شمارہ ہیں۔ پاکستانی ادبیات کے نام سے پاکستانی زبانوں میں رسالے کا آغاز کیا جس کے تحت ایک رسالہ تمام پاکستانی زبانوں پر شائع ہوا۔ اس کے تحت علیحدہ علیحدہ ''مزاحمتی ادب'' کے عنوان کے تحت (پشتو / ہندکو، سندھی، بلوچی / براہوی، پنجابی / سرائیکی، بلوچی / براہوی اور شنا / بلتی کے رسالے شائع ہوئے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی دیگر مطبوعات جو بطور مدیر منتظم ان کی نگرانی میں شائع ہوئیں ان میں ''اہل قلم ڈائریکٹری''، ''یونس ایمرے''، ''جدید اردو انشائیہ''، ''اردو افسانے کی روایت (۱۹۰۳ء۔۱۹۹۰ء)''، ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ''، ''ہیر وارث شاہ'' (اردو نثری ترجمہ حصہ اول، حصہ دوم)، ''جاگو جاگو'' (پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی ترجمہ)، ''کلام شاہ عبدالطیف بھٹائی'' (چار جلد)، ''منتخب سندھی افسانے''، ''سات نوبل انعام یافتہ ادیب''، ''وہ پھول کہ جن کا نام نہیں''، ''جاٹ کی کرتوت'' (پنجابی)، ''دوشیزہ'' (پشتو)، (اولین ناول کے اردو ترجمہ)، ''پیار دا پندھ'' (پنجابی)، ''مہرانی پندھ'' (بلوچی)، ''ددوستی سفر'' (پشتو) دوستی جو سفر (سندھی)، (چینی اہل قلم کا سفر نامہ پاکستان)، ''اردو مزاحیہ شاعری'' اور ''مزاحمتی ادب'' (اردو) شامل ہیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان پروگرام

اکادمی ادبیات پاکستان متعدد پروگراموں کے علاوہ ادیبوں کے ساتھ شام ملاقات کے انعقاد کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

مقتدرہ قومی زبان کی مطبوعات، بطور صدر نشین

مقتدرہ قومی زبان کے تحت بطور صدر نشین، افتخار عارف کی زیرِ نگرانی شائع ہونے والی کتابیں میں ''قانونِ انتقالِ جائیداد، شاد عظیم آبادی'' (کتابیات)، ''احادیث کے اردو تراجم''، ''پشتو زبان و ادب کی مختصر تاریخ''، ''فرہنگِ طلسم ہوشربا''، ''اصطلاحاتِ عمرانیات''، ''کتبِ لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ'' (جلد ہفتم)، ''بچوں کی لغت''، ''سائنسی و تکنیکی لغت''، ''اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ''، ''قرآنِ مجید کا عربی اردو لغت''، ''کشاف اصطلاحاتِ لسانیات''، ''تاریخِ صحافت، مولوی اسمٰعیل میرٹھی'' (کتابیات)، ''فرہنگِ تلفظ''، ''فرہنگِ اصطلاحاتِ طب''، ''پاکستان میں اردو انگریزی تنازع کی تاریخ''، ''اردو میں مستعمل عربی فارسی ضرب الامثال''، ''بیرون ممالک میں اردو''، ''معاشرہ شناسی''، ''اردو زود نویسی کا ارتقا''، ''اردو تھیسارس'' (طبع دوم)، ''داغ دہلوی'' (کتابیات)، ''لاشعور تک رسائی''، ''لسانی مسائل''، ''بچوں کے گیت''، ''تاریخِ ادبِ انگریزی''، ''اردو مختصر نویسی'' (طبع دوم)، ''فرہنگِ مشترک''، ''اطلاعیات: کمپیوٹری انقلاب پر گفتگو''، ''قیام پاکستان پر ایک محنت کش کا روزنامچہ''، ''قومی انگریزی اردو لغت'' (طبع دوم)، ''بیالوجی'' (گیارھویں جماعت کے لیے)''علمِ عروض اور اردو''، ''انگریزی پر اردو کا اثر''، ''پنجابی زبان و ادب کی مختصر تاریخ''، ''پاکستانی اردو کے خدوخال، بلوچی زبان و ادب کی مختصر تاریخ''، ''اردو کا صوتی نظام''، ''پاکستان: سال بہ سال''، ''فزکس'' (گیارھویں جماعت کے لیے)، ''پاکستان کی لوک داستانیں''، ''غالب کی خاندانی پینشن و دیگر امور''، ''قائداعظم محمد علی جناح'' (البم، اردو ایڈیشن، انگریزی ایڈیشن)، ''غیر فقاریہ جانور''، ''اصطلاحی مباحث''،

''کیمسٹری'' (گیارھویں جماعت کے لیے)، ''عظیم کتب جدید علمی و تعلیمی تقاضے''، ''فرہنگِ اصطلاحاتِ جغرافیہ''، ''فیچر، کالم اور تبصرہ''، ''اردو کے قدم اور چشتی صوفیہ''، ''ہندی اردو لغت'' (طبع دوم)، ''اصطلاحی جائزے''، ''عربی سیکھیے'' (جلد اول، طبع دوم)، ''اصولِ نفسیات'' (جلد اول طبع دوم)، ''پنجاب میں اردو'' (جلد اول، طبع دوم)، ''تدریسِ اردو'' (طبع دوم)، ''پاکستان کا جشنِ زریں'' (کتابیات)، ''پاکستانی کی جنگلی حیات''، ''تذکیر بایام اللہ''، ''پاکستان میں ترقیاتی منصوبہ بندی''، ''فرہنگِ اصطلاحاتِ فنِ تعمیر''، ''مکتوب نگاری'' (طبع دوم)، ''صحافتی ذمہ داریاں'' (طبع دوم)، ''صحت سب کے لیے''، ''مجلّاتی صحافت کے ادارتی مسائل'' (طبع دوم)، ''تربیت معتمدی''، ''توریثِ آدم''، ''بادشاہ''، ''تعلیم المتعلم''، ''اشارات وتنبیہات''، ''احصاء العلوم''، ''اشتہاریات'' (طبع دوم)، ''درِادراک''، ''طبیعیات''، ''دوثقافتیں''، ''کمال عترت''، ''قومی انگریزی اردو لغت'' (طبع چہارم)، ''جرمن اردو لغت'' (طبع دوم)، ''جینیاتی علمیات''، ''کلیاتِ قانون''، ''تاریخ و فلسفۂ سائنس''، ''ہند کو ضرب الامثال''، ''تصویری صحافت'' (طبع دوم)، ''فارماکولوجی'' (ترجمہ)، ''تخلیقی ارتقاء'' (ترجمہ) اور ''عوام کی بغاوت'' (ترجمہ) شامل ہیں۔

مقتدرہ قومی زبان کے تحت پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ''کتاب النفس''، ''بصیرت''، ''بوطیقا''، ''منہاجِ جدید'' ''معاہدہ عمرانی''، ''عظیم طاقتوں کا عروج وزوال''، ''زوالِ مغرب'' (جلد اوّل، جلد دوم)، ''خارجی دنیا کا علم''، ''اکیسویں صدی کے لیے تیاری'' کتابیں شائع کیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان ،بطور چیئرمین

اکادمی ادبیات پاکستان کی بطور چیئرمین افتخار عارف کی نگرانی میں اکادمی ادبیات پاکستان کے ماہنامہ خبر نامہ اس کے علاوہ کتابیات پاکستانی ادب ۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۷، انتخاب پاکستانی ادب (شاعری) ۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۷، انتخاب پاکستانی ادب (نثر) ۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۷ اور Pakistani

Literature کا دوبارہ اجرا کیا گیا جس میں سترہ عدد شمارے شائع ہوئے۔ان شماروں میں خواتین نمبر، پاکستانی انگریزی ادب نمبر شامل ہیں۔

بطور چیئرمین افتخار عارف کی زیر نگرانی سہ ماہی ادبی مجلّے ''ادبیات'' کے ۲۱ شمارے شائع ہوئے جس میں انتخاب خواتین کا عالمی ادب، سارک ممالک کا منتخب ادب، قیام پاکستان کے بعد: منتخب ادب، احمد ندیم قاسمی: خصوصی شمارہ، پاکستانی اہل قلم خواتین: خصوصی شمارہ، نثری نظم نمبر، مضافاتی ادب نمبر شامل ہیں۔

ان کی زیر نگرانی اکادمی ادبیات کی دیگر کتابوں میں ''نظمیں۔خطاطی اور محبت پاکستان کے لیے''، ''اقبال کے سو سال''، ''پاکستانی اہلِ قلم خواتین''، ''100 Years of Iqbal Studies''، Shooting Star(Balochi Short Story)، ''چین کا ادب'' (شاعری، فکشن) (انتخاب اور ترجمہ)، ''مکالماتِ کنفیوشس''، ''آٹھ اکتوبر تحریر کے آئینے میں''، ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح''، ''بلوچی زبان وادب'' (دوسرا ایڈیشن)، ''بدلتی ہوئی دنیا کا ادب کا کردار''، ''جدید بلوچی شاعری سے انتخاب''، ''ابیاتِ فرید''، ''جادانِ اقبال''، ''اردو مزاحیہ شاعری'' (دوسرا ایڈیشن) شائع ہوئیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان میں پاکستانی ادب کے معمار پر ۱۰۰ کتابوں سے زائد کتابوں پر کام شروع کیا گیا جس میں ۷۹ مشاہیر ادب ابوالفضل صدیقی، اجمل خٹک، احمد راہی، احمد شمیم، احمد فراز، ادا جعفری، امیر حمزہ خان شنواری، انتظار حسین، بانو قدسیہ، پروفیسر احمد علی، پروفیسر فتح محمد ملک، پروین شاکر، پطرس بخاری، تنویر عباسی، جانباز جتوئی، جمال ابڑو، جمیل الدین عالی، جوش ملیح آبادی، خواجہ غلام فرید، خوشحال خان خٹک، دوست محمد کامل، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، رحمٰن بابا، رضا ہمدانی، زیتون بانو، سائیں احمد علی، سچل سرمست، سرسید احمد خان (اشاعت دوئم)، سعادت حسن منٹو، سلطان باہو، سوبھو گیان چندانی، سید ظہور شاہ ہاشمی، سید عابد علی عابد،

شاہ عبداللطیف بھٹائی، شاہ مراد خانپوری، شاہد احمد دہلوی، شریف کنجاہی، شفیق الرحمن، شوکت صدیقی، شیخ ایاز، ضیاء جالندھری، عابد علی عابد، عبداللہ جان جمالدینی، عبداللہ حسین، عطا شاد، علامہ اقبال، فارغ بخاری، فتح محمد ملک، فخر زمان، فقیر محمد فقیر، فیض احمد فیض، فیض احمد فیض (دوسرا ایڈیشن)، قلندر مومند، کاکاجی صنوبر حسین، کرنل محمد خان، کشور ناہید، مجید امجد، محمد حسن عسکری، محمد خالد اختر، مخدوم طالب المولیٰ، مرزا قلیچ بیگ، مست توکلی، مسعود مفتی، مشتاق احمد یوسفی، ممتاز شیریں، ممتاز مفتی، منیر نیازی، مولانا صلاح الدین احمد، میاں محمد بخش، میر گل خان نصیر، میرا جی، ناصر کاظمی، ن۔م۔ راشد، وارث شاہ، یوسف ظفر پر کتابیں شائع ہوئیں۔

تصانیف

مہرِ دو نیم

مہرِ دو نیم افتخار عارف کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جو پہلی بار ۱۹۸۴ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اب تک اس کے پندرہ باضابطہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان کے ساتھ ساتھ یہ مجموعہ لندن اور دلّی سے بھی چھپ چکا ہے۔ اس کتاب کا پاکستانی ناشر مکتبۂ دانیال، کراچی ہے، جب کہ بھارت میں اس کے اشاعتی حقوق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے پاس ہیں اور ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلّی

۱۸۴ صفحات کے اس مجموعے میں ۶۴ غزلیں اور ۴۶ نظمیں ہیں۔ انتساب 'بابا' کے نام ہے۔ 'پیش نامہ' کے عنوان سے فیض احمد فیض کا ابتدائیہ اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون بعنوان 'نئی تنہائیوں کا دردمند شاعر' بھی کتاب میں شامل ہیں۔ سرورق حنیف رامے کے موقلم کا اعجاز ہے اور خطاط ہیں: عبدالرشید بٹ

حرفِ باریاب

حرفِ باریاب افتخار عارف کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے، جو پہلی بار ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ مکتبۂ دانیال، کراچی کے اہتمام سے باضابطہ طور پر اس

کتاب کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ ۱۲۲ صفحات پر مبنی اس مجموعے میں ۴۰ غزلیں اور ۲۶ نظمیں شامل ہیں۔ اس کتاب کا سرورق بھی حنیف رامے نے بنایا ہے۔ کتابت قاری احمد رضا آفاقی رقم نے کی ہے۔ انتساب اس طرح ہے:

یہ نہیں کہ صرف حرفِ باریاب اس کے نام
زندگی کے سارے رنگ، سارے خواب اس کے نام
جس کے نام زندگی کا انتساب
زندگی کی ہر کتاب اس کے نام

جہانِ معلوم

تیسرا مجموعہ جہانِ معلوم کے عنوان سے ۲۱ مارچ ۲۰۰۵ کو مکتبۂ دانیال، کراچی سے شائع ہوا۔ ۵۵ غزلوں اور ۲۰ نظموں کا یہ مجموعہ ۱۵۸ صفحات کو محیط ہے۔ 'کچھ غزل اور افتخار عارف کے بارے میں' اور افتخار عارف کی نعت، کے عنوانات سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے دو اظہاریے شامل کتاب ہیں۔ انتساب بٹی (گیتی)، داماد (کامران) اور ان کے دو بچوں (اظہر اور زینب) کے نام ہے۔ کتاب کی تزئین حنیف رامے (مصور) اور قاری احمد رضا آفاقی رقم (خطاط) کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ نیر مسعود، اختر الایمان، مشفق خواجہ، جون ایلیا، این میری شمل اور انا سواروا کی آرا بھی کتاب کی زینت ہیں۔

شہرِ علم کے دروازے پر

یہ مجموعہ مذہبی اور دینی روایت کی شاعری پر مشتمل ہے۔ اشفاق حسین نے اسے مرتب کیا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں اس کا ڈیلکس ایڈیشن مکتبۂ دانیال،

کراچی نے شائع کیا ہے۔ جیبی سائز میں جولائی ۲۰۰۶ء میں اس مجموعے کی اشاعت پورب اکادمی، اسلام آباد کے تعاون سے ہوئی ہے۔ مکتبۂ دانیال کا شائع کردہ ایڈیشن ۱۳۸ اور پورب اکادمی کا نسخہ ۲۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ماہ نامہ سپوتنک لاہور کے شمارے بابت فروری ۲۰۰۶ء میں بھی شامل ہے۔

کتابِ دل و دُنیا

یہ کتاب مکتبۂ دانیال، کراچی سے ۲۱ مارچ ۲۰۰۹ء کو شائع ہوئی۔ اس میں افتخار عارف، کا کل کلام شامل ہے۔ سرورق شاہد رسام نے بنایا ہے۔ کتاب ۵۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ 'سیاحتِ دل و دنیا' کے عنوان سے مبین مرزا نے افتخار عارف کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، اشفاق حسین، فیض احمد فیض، انتظار حسین اور پروفیسر فتح محمد ملک کے مضامین بھی شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب، سلیم احمد، فیض احمد فیض اور مشتاق یوسفی کے نام کیا گیا ہے۔

The Twelfth Man

برنڈا واکر نے افتخار عارف کی ۳۳ نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۹۸۹ء میں انگلینڈ سے چھپی۔ پاکستانی ایڈیشن مکتبۂ دانیال، کراچی نے شائع کیا۔ پیش لفظ این میری شمل نے، جب کہ اناسوروا (پروفیسر خاور شناسی :اکیڈمی آف سائنسز، ماسکو) نے Iftikhar Arif: A Glimpse from a Distant Country کے عنوان سے ابتدائیہ سپردِ قلم کیا۔ تعارفیہ عبداللہ الھد اری

کے حسنِ قلم کا نتیجہ ہے۔ پاکستانی ایڈیشن ۶۸ صفحات کو محیط ہے۔ انتساب گیتی اور علی کے نام ہے۔

Written in the Season of Fear

یہ کتاب افتخار عارف کی ۳۲ نظموں اور تین غزلوں کے انگریزی ترجمے پر مشتمل ہے۔ سات ترجمہ نگاروں کے تراجم اس کتاب میں شامل ہیں۔ تعارف حارث خلیق نے لکھا ہے۔ ۷۵ صفحات کی یہ کتاب آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی نے چھاپی ہے۔

مکالمہ

یہ کتاب افتخار عارف کی منتخب نظموں کے فارسی ترجمے پر مشتمل ہے۔ ترجمہ نگار ڈاکٹر انجم حمید ہیں۔

در کلو ندہ

عبداللہ جان عابد نے افتخار عارف کی تیس نظموں کا پشتو زبان میں ترجمہ کیا ہے، جو پشاور سے زیرِ اشاعت ہے۔

افتخارعارف جي نظمن جو سنڌي ترجمو

افتخار عارف کی نظموں کا سندھی ترجمہ اشاعت کے مراحل میں ہے، مترجم سعیدہ درانی ہیں۔

اعزازات

''مجھے ملنے والے تمام اعزازات، عہدے، اختیارات اور انعامات اپنی جگہ، لیکن اگر میرا لکھا ہوا حرف میرے بعد بھی: دس سال، پچاس سال، سو سال تک زندہ رہتا ہے، تو یہ میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہو گا۔ بڑا فن کار وہ ہوتا ہے جو وقت کو شکست دے۔ کس نے کتنی کامیاب زندگی گزاری، اس کا فیصلہ اس کی موت کے بعد ہوتا ہے۔'' (۴۴)

(۱) ہلالِ امتیاز: ۲۰۰۵ء

(۲) ستارۂ امتیاز: ۱۹۹۹ء

(۳) صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی: ۱۹۸۹ء

(۴) پاکستان رائٹرز گلڈ آدم جی ادبی ایوارڈ: ۱۹۸۴ء

(۵) قومی ہجرہ ایوارڈ: ۸۵۔۱۹۸۴ء (ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایوارڈ برائے شاعری اکادمی ادبیات پاکستان)

(۶) فیض انٹرنیشنل ایوارڈ (شاعری۔ عالمی اردو کانفرنس، بھارت): ۱۹۸۸ء

(۷) نقوش ایوارڈ: ۱۹۹۴ء

(۸) وثیقۂ اعتراف (ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان): ۱۹۹۴ء

(۹) بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ: شاعری ۱۹۹۵ء

(۱۰) قومی ہجرہ ایوارڈ: ۹۵۔۱۹۹۴ء (ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ایوارڈ برائے شاعری

اکادمی ادبیات پاکستان)

(۱۱) پاکستان کرسچین سٹیزن فورم ایوارڈ برائے ادب: ۲۰۰۱ء

(۱۲) خواجہ غلام فرید ایوارڈ: ۲۰۰۵ء

اے تو مجموعۂ خوبی بہ چہ نامت خوانم

''کسی کے لیے اس کی وجہ افتخار یا تو اس کی خاندانی نجابت ہوتی ہے یا علم وادب اور شعر وسخن کا حوالہ ہوتا ہے۔ علم وادب میں بھی شعر وسخن کے حوالے سے کوئی ایک آدھ شعر ایسا جو بین الاقوامی طور پر سفر کر رہا ہو اور جس شخص میں ان میں سے کوئی ایک بھی وجہ افتخار موجود ہو، تو وہ بجا طور پر فخر کرنے کا مستحق ہوتا ہے، مگر اس کو کیا کہیے کہ ایک شخص کیا ہوگا، جس میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہوں اور اس دور میں ان تمام خوبیوں کے مالک کا نام افتخار عارف ہے۔'' (۴۵)

''خوش رو، خوش گفتار، خوش اطوار، بزرگوں میں مؤدب، دوستوں میں بے تکلف، خوبروؤں میں مقبول، ملک بھر میں مشہور، بھری محفل میں چہکنے کے شائق، بولتے بولتے فقرہ ادھورا چھوڑ دینے کے عادی۔'' (۴۶)

''یہ ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے، جب افتخار عارف سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ کالج کے زمانے میں ہم چند دوست ادبی ذوق کے حوالے سے ناظم آباد کے ایک کافی ہاؤس 'الحسن' میں بیٹھا کرتے تھے اور یہ سلسلہ تقریباً دس سال پابندی سے جاری رہا۔ الحسن میں مستقل بیٹھنے والوں میں نیر سوز، نصیر ترابی، میاں عبدالرؤف، پیرزادہ قاسم، خلیق علوی، احمد عمر ندیم، عدیل لاری، وفا کانپوری اور مرزا معظم علی بیگ شامل تھے۔ ہم سب دوستوں میں ایک دو سال کے فرق سے نہ صرف عمر کی یکسانی تھی، بل کہ سب ہی شعر وادب کے دل دادہ تھے۔ پیرزادہ قاسم اور نصیر ترابی باقاعدہ شعر لکھتے تھے اور ریڈیو پاکستان کی بزمِ طلبہ کے زیرِ اہتمام مشاعروں میں شرکت بھی کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں کسی نوجوان کی بزمِ طلبہ کے پروگرام میں شرکت بڑی اہمیت رکھتی تھی، اس لیے

الحسن کافی ہاؤس شہر کے ادبی حلقوں میں ادب دوست نوجوانوں کی بیٹھک کے طور پر معروف تھا۔ ۱۹۶۶ء ہی کی ایک شام حلقے کے رکن خلیق علوی نے اطلاع دی کہ لکھنؤ سے آئے ہوئے ایک لڑکے سے ان کی ملاقات ہوئی ہے، جس کا ادبی ذوق باکمال ہے۔ اگر کہو، تو اس کو الحسن لے آؤں۔ ہم سب دوستوں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور اگلی شام افتخار عارف الحسن پہنچ گئے۔ فربہی مائل نکلتا ہوا وجود، سوچتی ہوئی آنکھوں پر عینک، کھدر کا کرتا پائجامہ، پیروں میں کولہا پوری چپل، آواز میں ایک خاص رس۔ 'جی' اور 'آپ' میں بسی ہوئی گفتگو، شعر سناتے ہوئے دونوں ہتھیلیوں کو باہم رگڑنا اور اس ادا سے اپنے اوپر اک مخصوص شاعرانہ کیفیت طاری کر لینے پر وہ قادر تھے۔ اس شام ہم سب افتخار عارف کی گفتگو، شاعری کے حوالے سے ان کی یادداشت، ان کے شعری ذوق کی اعلیٰ تربیت اور ان کے شائستہ رکھ رکھاؤ سے نہ صرف متاثر ہوئے، بل کہ افتخار عارف الحسن کی بیٹھک کا مستقل حصہ ہوگئے۔ یہ وہ وقت تھا، جب تعلیم سے فراغت کے بعد ہماری عمریں کسی پائیدار روزگار کے حصول کی پُراسرار اور تھکا دینے والی گلیوں میں بھٹک رہی تھیں اور ہمارے دل ادبی ذوق کے حوالے سے کسی ایسی شناخت کے آرزومند تھے، جو معتبر بھی ہو اور ممتاز بھی۔ اس وقت افتخار عارف موزوں طبع ہونے کے باوجود بالاعلان شاعر نہیں تھے۔ ان کو قدیم وجدید شعرا کے ہزاروں اشعار ازبر تھے اور ادبی واقعات و لطائف بھی یاد تھے۔ جعفر علی خان اثر اور آنند نرائن ملا سے لے کر والی آسی اور ساغر مہدی تک اور مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا رضا انصاری فرنگی محلی کے صحبت یافتہ، فرنگی محل، جوبلی کالج اور لکھنؤ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل، فقرہ سازی، بذلہ سنجی اور ادبی بھید بھاؤ سے آگہی کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی اور سنسکرت سے واقفیت ان کی شخصیت کا امتیاز تھی۔ لہٰذا افتخار عارف کی الحسن آمد نے نہ صرف ہم سب دوستوں کے دل جیت لیے، بل کہ اپنی سنجیدہ، روشن تخلیقی ذہانت اور علمی بالادستی سے الحسن کی بیٹھک کو اعتماد فراہم کیا۔ افتخار چوں کہ کراچی میں تازہ وارد تھے، اس لیے شعرا میں ان کی شناسائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ لہٰذا ان کا بیشتر وقت الحسن کے

دوستوں کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ ابتداً وہ معروف نیوز کاسٹر شکیل احمد کے ذریعے ریڈیو پاکستان کی شہری سروس سے وابستہ ہوئے۔ ریڈیو اسٹیشن پر ان کی ملاقات بھائی عبیداللہ بیگ اور قریش پور سے ہوئی اور پھر وہ ایک پروگرام کسوٹی کے حوالے سے ٹیلی وژن اسٹیشن پہنچ گئے۔ اس پروگرام سے افتخار عارف کی صلاحیتوں کا غلغلہ بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے زیڈ اے بخاری، سلیم گیلانی، اسلم اظہر، پروفیسر حسن عسکری، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، سید سبطِ حسن، عزیز حامد مدنی، سلیم احمد اور قمر جمیل سے لے کر علامہ رشید ترابی، مولانا احتشام الحق تھانوی، علامہ ابنِ حسن جارچوی اور مولانا حسن مثنیٰ ندوی سب ہی ان کے معترف نظر آنے لگے۔ یہ دور افتخار عارف کی زندگی کا شاید سب سے زیادہ پُر احوال دور تھا۔ اسی دور میں ان کی شہرت اور شناسائی سرما کی دھوپ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی اور اسی دور میں انھوں نے پاکستان ٹیلی وژن میں بہ حیثیت اسکرپٹ ایڈیٹر ملازمت اختیار کی، مگر مصروفیت اور مقبولیت کے تند بہاؤ میں بھی انھوں نے اپنے بنیادی دوستوں کو ترک نہیں کیا۔ جب موقع ملا دوستوں میں آن بیٹھے۔ مراسم و ملاقات کی ایسی ہی نشست میں افتخار عارف نہ صرف ایک شرعی معشوق سے منسلک ہو گئے، بل کہ انھوں نے باقاعدہ شاعری بھی شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا شمار مقبول ترین شعرا میں ہونے لگا۔'' (۴۷)

''لوگ سمجھتے ہیں کہ افتخار عارف کی باتیں پھلجھڑیاں ہیں۔ میں بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ پھر ایک دن دلّی کے اشوکا ہوٹل میں مجھ سے فاش غلطی سرزد ہو گئی۔ اس کا انٹرویو لینے کے لیے میں نے اسے چھیڑ دیا۔ بھڑوں کا چھتا چڑ گیا۔ انتقاماً افتخار عارف نے اپنی آپ بیتی چھیڑ دی۔ ایک دم منظر بدل گیا؛ پروا چلنے لگی؛ گھور گھٹائیں چھا گئیں؛ افتخار عارف یوں موسلا دھار برسا کہ نہ افتخار عارف رہا، نہ ممتاز مفتی، نہ اشوکا ہوٹل، نہ دلّی؛ سب پانی پانی ہو گیا؛ سب ڈوب گئے۔ تب میں نے جانا کہ قدرت کنول کا پھول کھلانے کے لیے پہلے جھیل بناتی ہے، چھل چھل چھلچھلاتی جھیل؛ گلاب کا پھول کھلانے کے لیے پہلے کانٹے لگاتی ہے۔ صاحبو! یہ کہانی صرف افتخار عارف ہی کی نہیں، آپ کی بھی ہے، ہر تخلیق کار کی ہے۔'' (۴۸)

''افتخار عارف کو میں نے پہلی مرتبہ ٹیلی وژن کے پروگرام میں دیکھا تھا۔ تینوں 'کسوٹیے' میرے سامنے کھڑے تھے۔ عبید، قریش اور عارف۔ تینوں کے دامن معلومات، ذہانت اور یادداشت سے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے چند سوالات میں میرا پھلکا اڑا دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اتفاق سے افتخار کو تنہائی میں دیکھا۔ بات پلے نہ پڑی۔ اس میں روانی بھی تھی، احتیاط بھی، روشنی بھی تھی، بجھن بھی، تڑپ بھی تھی، لیکن پتا نہیں چلتا تھا کہ آگے بڑھنے کی ہے یا سمٹ کر پیچھے ہٹنے کی۔ غالباً دونوں تھیں، بیک وقت دونوں۔ صاحبو! بیک وقت دونوں ہوں، تو تماشا بن جاتا ہے۔

پھر کچھ دیر کے بعد افتخار عارف کے شعر گونجنے لگے۔ فضا بھر گئی۔ ان شعروں میں رنگینی تھی، آوارگی تھی، دعوت تھی، وحشت تھی اور سب سے بڑھ کر افتخار عارف تھا۔ اتنی انفرادیت تھی کہ ایک ایک مصرع پر مہر لگی ہوئی تھی؛ ایک ایک مصرع بول رہا تھا، سننے میں آیا کہ کراچی کی لڑکیاں طواف کر رہی ہیں۔ افتخار راجا اندر بنا بیٹھا ہے۔ پنگھٹ پر وحشتوں کے ساتھیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ افتخار عارف میری دانست میں، پہلا تخلیق کار ہے، جس نے برملا الفاظ میں کہہ دیا کہ فنکار وحشتوں کے تابع ہوتا ہے۔ پہلا شاعر، جس نے وحشتوں کے ساتھی کی آرزو کا برملا اظہار کر دیا، بھید کھول دیا۔ شہرت کی چاندنی میں افتخار عارف خوب نہایا۔ انداز میں وحشتیں جاگیں۔ 'Who Cares' ہٹاؤ، چھوڑو رویے ظاہر ہوئے، محبوبیت نے لشکارے مارے، سب کچھ ہوا، لیکن یہ سب کچھ اوپر کی منزل میں ہوا۔ نیچے کی منزل میں وہی لاوارثی کا اندھیرا، دکھ کی بھیگ، تلخ یادوں کے مکڑے جالے تنتے رہے۔'' (۴۹)

''افتخار عارف کو میں تین زاویوں سے جانتا ہوں۔ ایک زاویے سے مجھے وہ ٹیلی وژن کی ایک دل کش شخصیت دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے زاویے سے ایک ایسا نوجوان، جس کی یادداشت عام انسانوں سے زیادہ ہے اور پھر ایک زاویہ ایسا بھی ہے، جس سے مجھے وہ صرف ایک خوب صورت شاعر نظر آتا ہے۔ وہ لکھنؤ کے تہذیبی ورثے کی روایت اپنی غزل میں اس طرح لے آتا ہے کہ

کلاسیکی شاعروں کی آوازوں کے بیچ خود اس کی آواز بھی اُبھرنے لگتی ہے، لیکن افتخار عارف کبھی مشرق کی روح سے اس طرح دور نہیں ہوسکتا، جسے آج کے عہد کے بے بہرہ انسان کی آواز کہا جاسکے۔''(۵۰)

افتخار عارف کا نام ہم نے سب سے پہلے پی ٹی وی کے ایک مقبول پروگرام 'کسوٹی' کے حوالے سے سنا تھا، نام کے ساتھ چہرہ بھی دیکھا، وہ نام چندے خوب چلا؛ خوب چمکا، مگر جلدی ہی وہ چہرہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور نام پردۂ اخفا میں چلا گیا۔ اچھا ہی ہوا۔ زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ وہ حوالہ بھی اب یاروں کو کم کم یاد ہے؛ اب یاد بھی آتا ہے، تو اس طرح جیسے بڑے ہوکر شریف آدمی کو کبھی کبھی اپنے لڑکپن کی غلط کاریاں یاد آجاتی ہیں، مگر آدمی کو غلط کاریوں سے مفر تو نہیں۔ اچھا یہ ہے کہ لڑکپن ہی میں آدمی یہ کام کرلے اور آگے گزر جائے۔ سو افتخار عارف نے لڑکپن میں یہ کام کیا اور اس طرح کہ چاند چڑھے کل عالم دیکھے۔ پھر شتابی سے فارغ ہوئے اور لندن چلے گئے۔ وہاں اردو مرکز میں جابراجے۔ وہاں کچھ اردو کی خدمت کی، کچھ یاروں کی، مگر جہاں یار ہوں گے، وہاں اغیار بھی ہوں گے، تو لندن سے انھوں نے جو کمائی کی، اس میں دونوں ایسے کتنے نگ انھیں میسر آئے، پھر جس گھوڑے پہ سوار تھے، وہ گھوڑا ہی ختم ہوگیا۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

افتخار عارف سے علیک سلیک تو پہلے بھی تھی، مگر ان سے ملاقات اصل میں لندن میں ہوئی۔ وہاں میں رسمی طور پر اردو مرکز کا مہمان تھا۔ اصل میں مہمان تھا افتخار عارف کا، سو جلدی ہی بستر بوریا ہوٹل سے اٹھایا اور ان کے گھر آکر پسر گیا۔ تب پتا چلا کہ یہ لکھنؤ کا دانہ ہے کہ لندن میں آکر گل وگلزار بن گیا ہے۔ خیر لکھنؤ سے تو اور کتنے دانے لڑھک کر پاکستان آئے تھے، اب وہ پہچاننے میں نہیں آتے۔ اہلِ زبان ہیں، مگر زبان انھیں غچہ دے گئی، تو اب جیسے ہم ایسے ہمہ شما ویسے وہ۔ لکھنؤ والے۔ تو ان کے طفیل ہوا یہ کہ مجھ پہ جو لکھنؤ کا رعب تھا، بل کہ رعاب شعاب تھا، وہ اٹھ گیا، مگر اب جب افتخار عارف نے اپنے شہر کی شخصیتوں کے حوالے دینے شروع کیے اور

بتانا شروع کیا کہ انھوں نے کیسے کیسے مجتہد؛ کیسے کیسے محقق؛ کیسے کیسے شاعر کی آنکھیں دیکھی ہیں، کس کی دیوار سے ان کے گھر کی دیوار ملی ہوئی تھی؛ کس سے ان کی دانت کاٹی تھی؛ کیسے کیسے علامہ سے انھوں نے اپنے شعر پر داد لی تھی اور کس کی زبان پر انھوں نے بصد ادب ٹوکا تھا، تو لگا کہ جس رعب سے ہم نکل آئے تھے، وہ بحال ہونے لگا ہے۔ اب دیکھیے! میں تو قصباتی مخلوق ہوں، انیس اور سرشار کے شہر سے جو آ رہا ہو، اس کے مقابلے میں میں ایسے حوالے کہاں سے لاتا؟ ابھی میں نے ان کا ایک انٹرویو پڑھا ہے، جس میں ایسی ایسی شخصیتوں کے حوالے ہیں اور ان سے ان کا ربط وضبط کہ میرے احساسِ کمتری میں ایک دم سے کتنا اضافہ ہو گیا۔ ویسے اب افتخار عارف کو حوالوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ خود حوالہ بن چکے ہیں۔'' (۵۱)

''افتخار عارف سے ہم جب پہلی مرتبہ ملے، تو وہ شاعر نہیں تھے یا ہمیں ان کی شاعری کا علم نہ تھا، مگر وہ مشہور ترین شعرا سے بھی زیادہ مشہور تھے۔ ان کی وجہ شہرت ٹیلی وژن کا مقبول ادبی پروگرام 'کسوٹی' تھا، جس سے افتخار عارف اور عبید اللہ بیگ کی جوڑی کو اتنی بے پناہ شہرت حاصل ہوئی کہ بعد میں ان مشہور لوگوں کو مضبوط ہونے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ پھر یہ لندن چلے گئے۔ وہاں بھی ایک دو مرتبہ ہمیں ان سے ملنے کا موقع ملا۔ انگریزوں نے کلکتے میں 'اردو فورٹ ولیم' قائم کیا تھا...... افتخار عارف نے دو ڈھائی سو برس بعد لندن میں اردو کا 'لاہور فورٹ' قائم کر دکھایا۔ لہٰذا تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہی نہیں، اڑاتی بھی ہے۔ ان کی شاعری کا چرچا بھی وہیں سے اڑ کر ناروے، جرمنی، ہالینڈ وغیرہ کے راستے وطن تک پہنچا۔ افتخار عارف کو قریب سے دیکھنے، جاننے کا اتفاق گزشتہ دو تین برسوں سے میسر آیا۔ جب وہ لندن سے اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل ہو کر اسلام آباد میں وارد ہوئے۔

ہمیں بھی ابتدا میں افتخار عارف پسند نہ آئے۔ وجہ غالباً اس شخص کی ذہانت تھی...... مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی تھے...... مثلاً: یہ کہ بات وہ اچھی کرے...... شعر وہ اچھا کہے...... شہرت کا سورج اس کے سر پر رہے...... شاعروں کا اسٹار...... ادبی مجالس کا سنگھار...... ایک بہت اونچی کرسی پر فائز اور حد یہ

کہ لکھنو کا۔ ہمارے ہاں ایسے شخص کو بہ مشکل برداشت کیا جاسکتا ہے، پسند نہیں کیا جاسکتا، مگر صاحبو! جب یہ شخص سمجھ میں آتا ہے، تو پھر آپ اس پر دل کے دروازے بند نہیں کرسکتے۔ مشرقی وضع داری کا کوئی نمونہ دیکھنا ہو، تو ان کو دیکھیے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے، جن کے قدم ماضی میں ہوتے ہیں اور سانس مستقبل میں لیتے ہیں۔ بزرگوں سے تپاک و سعادت مندی کا یہ عالم کہ میں تو اپنی تجہیز و تکفین کے انتظامات بھی اطمینان کے ساتھ اس کے سپرد کرسکتا ہوں۔'' (۵۲)

''افتخار عارف میرے ان دوستوں میں سے ہے، جن کی شخصیت کی تہہ تک پہنچنا صرف دوسروں کے لیے نہیں، بلکہ خود ان کے لیے بھی قریباً ناممکن ہے۔ میں جتنا افتخار کے قریب جاتا ہوں، اتنا ہی الجھتا چلا جاتا ہوں۔ وہ بظاہر کچھ اور نظر آتا ہے، درحقیقت وہ کچھ اور ہے، مثلاً، دیکھنے میں وہ مکمل طور پر ایک دنیادار شخص ہے، مگر میں یہ بھی جانتا ہوں وہ ایک عبادت گزار شخص ہے؛ وہ آدھی رات کو خدا کے حضور آہ و زاری کرنے والا سوالی ہے۔ بظاہر وہ عہدہ و منصب کی ہوس میں مبتلا ہے، لیکن یہ سب کچھ حاصل کرنے کے بعد وہ فیڈرل لاج اسلام آباد کے جس 'سوٹ' میں رہتا ہے، اس میں دو چار پائیاں بچھی ہیں، جن میں سے ڈیڑھ چارپائی پر اس کی کتابیں اور باقی آدھی چارپائی پر سارا دن آداب کہتا اس کا تھکا ہوا جسم پڑا رہتا ہے۔ وہ مقتدرہ قومی زبان کا چیئرمین ہے، گریڈ بائیس کا افسر ہے، لیکن روزانہ دوپہر کو اس کا لنچ دال کی ایک پلیٹ اور ایک خشک روٹی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ کنجوس ہے۔ وہ بہت دریا دل شخص ہے، لیکن لگتا ہے، وہ اپنے نفس کو سزا دینے پر تلا ہوا ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا کوئی دوست نہیں ہے، اس کا کوئی دشمن نہیں ہے، یہ تاثر درست نہیں۔ وہ بلاشبہ تعلقاتِ عامہ کا ماہر ہے، لیکن وہ دوست اور دشمن دونوں رکھتا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ دوستوں کو اس کی دوستی اور دشمنوں کو اس کی دشمنی کی خبر دیر بعد ہوتی ہے۔ اس کے دوستوں میں: مشتاق احمد یوسفی سو فیصد، انتظار حسین اسی فیصد اور میں پچاس فیصد والی کیٹیگری میں آتا ہوں، تاہم جن دوستوں سے اسے جنون کی حد تک محبت ہے، وہ اس کا بیٹا علی، بیٹی گیتی، نواسہ اظہر محمود اور نواسی زینب ہیں۔ لگتا ہے وہ اس دنیا

میں صرف انھیں کے لیے جیتا ہے۔ افتخار عارف جس طرح کی صحبت میں بیٹھا ہو، اسی صحبت کا لازمی حصہ لگتا ہے، لیکن وہ ایک عالم شخص ہے اور اس کی مہارت کے تین شعبے ہیں: (۱) دینیات (۲) ادب (۳) معلوماتِ عامہ۔ تاہم اس کے عالم ہونے کا 'شبہ' آپ کو تبھی ہوگا، اگر آپ ان موضوعات پر اس سے پنگا لینے کی کوشش کریں گے۔ بہ صورتِ دیگر وہ پھکڑوں کی محفل میں سب سے بڑا پھکڑ باز ہے اور اگر کوئی غیبت کی محفل ہے، تو وہاں بھی اس کی حیثیت صدرِ محفل کی سی ہے؛ یہ وہ نگینہ ہے، جو ہر انگشتری میں فٹ بیٹھتا ہے۔

افتخار عارف ایک بذلہ سنج آدمی ہے؛ زبردست جملے باز ہے اور اس عالم میں بسا اوقات وہ اپنی وضعداری کو بھی ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ چند برس قبل لندن میں مشتاق احمد یوسفی کے فلیٹ میں پاکستان سے آئے ہوئے مہمانوں کے اعزاز میں ایک محفل برپا تھی۔ ایک ممتاز پاکستانی شاعر بھی اس محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے باتوں باتوں میں اپنی بیاض کے گم ہونے کا ذکر کیا، تو امجد نے افتخار کو مخاطب کیا اور ازرہِ تفنن کہا: 'تم اپنی بیاض انھیں کیوں نہیں دے دیتے؟' افتخار نے کہا: 'دے تو دوں، مگر میری بیاض میں تو کچھ اچھے شعر بھی ہیں۔'' (۵۳)

''منتخب سیاست کاروں کے ہاسٹل میں رہتے ہوئے بھی یہ 'بڑا آدمی' نہیں بن سکا۔ نمازیں، تلاوت، وظائف، تہجد اس کے معمولات کا حصہ ہیں۔ لوگوں کو نوکریاں دلانے کے جھوٹے وعدے کرتا ہے، نہ ہی روپے لے کر سفارشی رقعے لکھتا ہے۔ اس کے کمرے سے شراب کی بوتلیں ملتی ہیں، نہ ہی رات کی تاریکی میں حوا کی بیٹیاں مہمان ہوتی ہیں۔ برسوں سے اونچی سوسائٹی میں رہتے ہوئے بھی وہاں کے آداب واطوار نہیں اپنا سکا۔

'خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے'، 'لوہار کے پاس بیٹھنے سے لباس پر چنگاریاں تو ضرور گرتی ہیں اور ایسی ہی دیگر مثالوں کو افتخار عارف نے غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ میں افتخار عارف کی پارسائی کی قسم تو نہیں کھاتا، مگر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ لکھتا ہوں کہ یہ ایک صاف نیت اور مطمئن ضمیر انسان ہے۔

افتخار عارف کا ایک وصف جو بہت نمایاں ہے، وہ اس کی جاننے والوں سے شدید محبت ہے۔ یہ اپنے دفتر میں، ہاسٹل میں اور محفلوں میں ہر ملنے والے سے یوں ملتا ہے، جیسے زندہ ہی اسی کی خاطر ہے۔ ایسی گرم جوشی، ایسے راز و نیاز اور بے تکلفانہ جملے بازی کہ ملاقاتی سرشار ہو جاتا ہے۔ یہی ملاقاتی جب دیوار کے اس پار چلا جاتا ہے، تو افتخار عارف کے لیے ایسا اجنبی ہو جاتا ہے، جیسے کبھی دیکھا یا سنا ہی نہ ہو۔" (۵۴)

"شاعر، ادیب یا کوئی بھی تخلیق کار اپنے ہنر میں خواہ کتنا ہی یکتا کیوں نہ ہو، اگر وہ اچھا انسان نہیں ہے، تو اس کا سارا ہنر دھندلا جاتا ہے اور وہ اپنے مداحوں کا وہ حلقہ پیدا نہیں کر پاتا، جس کا واقعی وہ مستحق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے، تو جنابِ افتخار عارف اچھے شاعر ہی نہیں، اچھے اور بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ وہ اپنے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ برتاؤ کا سلیقہ تو جانتے ہی ہیں، عام لوگوں کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کا وہی معیار برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے حلقۂ احباب میں ہر طبقۂ فکر اور مزاج کے لوگ شامل ہیں۔ وہ بھی جو ان کے شعر کے دیوانے ہیں اور وہ بھی جو محض ان کی شخصیت کے پروانے ہیں۔ افتخار عارف صاحب نے ان سب لوگوں کو اپنی من موہنی مسکراہٹ اور اپنی انکساری کے سحر میں گرفتار کر رکھا ہے۔ یہ انکساری تصنع سے آلودہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس خوبی نے انھیں مرجعِ خلائق بنا رکھا ہے۔ ہر وہ شخص جو ان سے ایک بار مل لیتا ہے، انھی کا ہو کر رہ جاتا ہے، وہ انھیں اپنے دل کے قریب محسوس کرتا اور ان سے کسی غرض کے بغیر پیار کرنے لگتا ہے۔" (۵۵)

"یہ ۱۹۸۲ء کے موسم خزاں کی بات ہے۔ ٹورنٹو میں پہلی بار ایک عالمی اردو کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کے ساتھ ہی مشاعروں کا بھی سلسلہ تھا، جو کینیڈا اور امریکہ کے مختلف شہروں تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی سلسلے کا ایک مشاعرہ لاس اینجلس میں ہونے والا تھا، جہاں لندن سے افتخار عارف کے علاوہ احمد فراز بھی مدعو تھے، جو ان دنوں لندن میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ لاس اینجلس کے اس مشاعرے میں مجھے بھی ٹورنٹو سے مدعو کیا گیا تھا اور ہم تینوں مہمانوں

کا قیام سید محمد جعفری مرحوم کے فرزند احمد جعفری کے گھر پر تھا۔ احمد ان دنوں اکیلے ہی رہتے تھے اور انھیں صبح بہت ہی سویرے دفتر جانا پڑتا تھا۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ چلو اب تمھارے آنے سے ایک مسئلہ تو حل ہوگیا کہ کم از کم مہمانوں کو صبح کا ناشتا وقت پر مل جایا کرے گا۔ رات کو ہم لوگ کھانے سے واپس آئے، تو احمد جعفری فوراً سونے چلے گئے اور ہم لوگ بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ غالباً صبح تین ساڑھے تین بجے کے قریب ہم بھی سونے چلے گئے اور میرا خیال تھا کہ اب ہم تینوں بہت اطمینان سے دیر تک سونے کے بعد اٹھیں گے، مگر صبح معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا، یعنی جو اصل مہمان تھے، وہ خود اپنے لیے چائے وائے بنا کر پی چکے تھے اور میرے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میری آنکھ اس وقت کھلی، جب افتخار نے میرے منہ پر پانی کا چھڑکاؤ کیا اور کہا: 'ابے اشفاق! اب اٹھو بھی، کب سے جگا رہے ہیں تم کو' تو معلوم ہوا کہ دونوں ہی مہمان علی الصبح اٹھنے کے عادی ہیں۔ ایک چہل قدمی کے لیے اور دوسرا اوّل وقت نمازِ فجر کے لیے۔ یہ دوسری شخصیت افتخار عارف کی تھی۔" (۵۶)

"افتخار عارف کے لیے اگر مجھ سے کہا جائے کہ ان کی تعریف ایک جملے میں کرو، تو میں کہوں گی کہ: 'وہ بڑے بزدل، کمزور، بے اعتبار اور بہت اکیلے انسان ہیں، نہ وہ کسی کے ہیں، نہ انھیں یہ یقین ہے کہ کوئی ان کا ہے۔

دنیا کی اس بھیڑ میں وہ کھوئے ہوئے بچے کی طرح تنہا اور خوف زدہ گھوم رہے ہیں۔ سہارے کے لیے ایک ایک کو تھامتے ہیں، جب جان جاتے ہیں کہ ہاتھ پکڑنے والا اجنبی ہے، غیر ہے، تو پھر کسی اور طرف چل دیتے ہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اور بھٹکتے بھٹکتے اور کھو گئے ہیں۔ بے یقینی اتنی بڑھ گئی ہے کہ نہ اپنے جذبوں کا اعتبار رہا ہے، نہ دوسروں کے۔ خدا جانے یہ بے اعتباری اور بے یقینی انھیں کس نے دی ہے؟ میراث میں ملی ہے یا خود اپنے تجربوں سے حاصل کی ہے، لیکن سچائی یہی ہے کہ وہ بڑے بے اعتبار ہیں۔ محبت ان کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے اور مجبوری بھی؛ محبت ان کا سب سے بڑا ہتھیار بھی ہے اور ان کی شکست بھی۔" (۵۷)

''میں نے انھیں کتاب کی مانند پڑھا ہے؛ سمجھا ہے، ایک ایسی دلچسپ کتاب کی طرح، جو ایک بار پڑھنے بیٹھو، تو ختم کیے بغیر چین نہ آئے اور جسے پڑھنے کے بعد خوشی بھی ہوتی ہے اور کسک بھی ہوتی ہے اور عرصے تک یہ خلش نہیں جاتی۔'' (۵۸)

''ایک افتخار عارف تو وہ ہیں، جنھوں نے ٹی وی کے پروگرام کسوٹی کے ذریعے ناظرین کے ذہن میں اپنی ذہانت اور حافظے سے گہرے نقش چھوڑے ہیں اور دوسری حیثیت میں وہ شاعر ہیں۔ شاعری کے حوالے سے افتخار عارف کا کہنا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے انعام ہے، ورنہ آپ کسی بھی آدمی کو زندہ الفاظ دیں، تو اگر اسے اللہ نے شعر کہنے کی توفیق عطا نہیں کی ہے، تو وہ ان الفاظ کو پتھر بنا کر آپ کو لوٹا دے گا اور شاید اسی لیے وہ دعوے سے کہتے ہیں کہ میں نے کبھی شکن آلود لباس زیبِ تن نہیں کیا اور نہ کبھی کوئی شکن آلود مصرع کہا ہے۔'' (۵۹)

''افتخار عارف کو دیکھنا ہو، تو اس وقت دیکھو، جب وہ اکیلا بیٹھا ہو۔ جب اسے یقین ہو کہ گرد و پیش میں دور دور تک کوئی دیکھنے والا موجود نہیں۔ اس وقت اس کا سینہ شق ہو جاتا ہے۔ اس میں سے ایک ٹوٹ نکلتی ہے، ایک ویرانی، ایک خلا؟ افتخار عارف کو جان لینا چاہیے کہ صرف ایک چیز ہے، جو اسے اس خلا کی دست برد سے بچا سکتی ہے:...... تخلیق! تخلیق! مسلسل تخلیق!'' (۶۰)

''افتخار عارف ایک نرم خو، ہنس مکھ، روشن چہرے اور بولتی آنکھوں والا شخص ہے۔ دیکھنے میں اپنے مزاج کی نرم خوئی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید بے حوصلہ اور کمزور عزائم کا آدمی ہو گا، لیکن قریب سے دیکھو، فیصلوں کے میزان پر تولو اور اس کے شب و روز پر؛ اس کے متنوع معمولات پر نگاہ کرو، تو وہ صرف شاعر نہیں ہے، بلکہ شعر کی زبان میں اپنے چٹان جیسے عزائم کا اظہار بھی ہے۔'' (۶۱)

یہ التزام بھی عرضِ ہنر میں رکھا جائے

افتخار عارف کی غزل کا فکری اور فنی مطالعہ

افتخار عارف کی شاعری دُعا اور اس کے تلازمات سے پھوٹی ہے۔ دُعا...... جوان کی کمزوری کا اثبات بھی ہے اور ان کی تاب اور توانائی کا سبب بھی۔ دُعا ان کی شاعری کی فکری تہذیب اور فنی جمالیات کی امین ہے۔ ان کے لہجے کے سارے رنگ اسی دُعا کی بدولت یقین کا سراپا اوڑھتے ہیں، تو ان کا استعاراتی آہنگ: خواب اور خیال کی تہذیب سے مملو ہو کر، ایک ایسے جہانِ معنی کی تخلیق کرتا ہے، جو فرد کے باطن کو یقین اور اثبات کی نئی اور تازہ کار فکری تعبیر سے ہم آہنگ کر دیتا ہے اور یوں تخلیق کار اپنے فکری تذبذب اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انتشار سے بچ نکلنے میں کامگار ہو جاتا ہے۔ یہ کامگاری......اور تذبذب سے اثباتِ یقیں تک کا سفر اپنی ذات کے نہاں خانوں میں، مراقبے کی تپسیا سے ممکن ہو سکتا ہے، کیوں کہ 'دُعا' کا تمثیلی اور استعاراتی آہنگ: جب ہاتھ اٹھا کر مانگنے کے روایتی تناظر سے ہٹ کر، اور چپ کی بُکل میں لپٹے ایک وجود کی ہم کلامی سے بڑھ کر، اس کی خود کلامی کے منظر نامے تک پھیل جائے، تو دُعا تخلیق کے ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، جو فکر کی تابانی اور تخلیق کی معنوی رعنائی کا اشاریہ ہوتے ہیں۔ علّامہ عبدالعزیز خالد رقم طراز ہیں:

> ”دعا ایک عجیب لطیف وسبک، پُراسرار و کرشمہ ناک شے ہے، جس کی طاقت ورسائی کا ذہنِ بشرادراک نہیں کر سکتا۔ کیسے یہ آفاق وافلاک کے ہوش اڑا دینے والے، لامتناہی فاصلوں کو دم زدن میں طے کرتی؛ ناسوت کو لاہوت سے ملاتی؛ عرشِ عظیم کے بابِ منور پر جا کر صدا دیتی ہے۔

سراسر ایک سربستہ کائناتی راز ہے۔ بہ قولِ اقبال: ’دعا سے خفیہ روحانی قوتیں بیدار ہوتی ہیں‘۔ دُعا راز و نیاز کا وہ عمل ہے، جو خالق و مخلوق کے درمیان حائل حجابات کو اٹھا کر ایک زبانِ بے زبانی میں: ایک مکانِ لامکانی میں انھیں ہم کلام کراتا ہے۔ دُعا سے طبیعت کو عجب انشراح و اہتزاز حاصل ہوتا ہے، جیسے آنسو آنکھوں کی دوا اور شفا ہیں، ایسے ہی دُعا دل کی غذا اور دوا ہے؛ یہ طبعِ بے قرار کو اپنی مسیحا نفسی سے سکینت و سکون مہیا کرتی ہے۔ انسان کے اندر دُعا کے بعد ایک نیا عزم؛ ایک نیا ولولہ جنم لیتا ہے۔ ایک نئی عزیمت و آرزو مندی سے اس کی رگوں کا ست خون موجزن ہو کر گگن کھیلنے لگتا ہے، جیسے بارش کے بعد گرد و غبار دھل جاتا ہے اور ہر شے پر ایک نیا نکھار؛ ایک نیا رنگ روپ آ جاتا ہے، ایسے ہی خدا کے حضور آہ و زاری کے بعد کثافت و کدورت کا زنگ چھٹ جانے کے بعد طبیعت انتہائی ہلکی پھلکی اور فرحت و راحت کے ایک انوکھے جاں بخش احساس سے ہمکنار ہوتی ہے۔ لذتِ دُعا ایک بڑی نعمت ہے۔" (۶۲)

افتخار عارف کی غزل میں دُعا کی معنویت کا یہی تخلیقی پھیلاؤ، ان استعاراتی رویوں کو جنم دیتا ہے، جو خواب، خیال اور خاک کے متصوفانہ رویوں کے نقیب ہیں۔ سلسلۂ چشتیہ کی معنوی اور فکری روایت میں خاک، خیال اور خواب کی جو فکری معنویت سلسلے کے جمالیاتی شعور اور وجدان سے مستنیر ہوئی ہے، وہ زندگی کے ہمہ گیر اور ہمہ رنگ فلسفے کے تمام تر پہلوؤں کو محیط ہے۔ ان استعاراتی رویوں کا تخلیقی اظہار جب شعر و ادب کا سراپا اوڑھ کر، فکر و شعور کا سرمایہ بنتا ہے، تو رعنائی خیال کی خوش آہنگ تعبیر اپنے تمام تر جمالی رنگوں کی تعبیر سے مزین ہو جاتی ہے اور اس کا تخلیقی اظہار لمحۂ موجود کے کرب، دکھ اور درد کو آئینۂ احساس کے صدہا تجربوں کا عکاس بنا دیتا ہے۔ اس طرح انکسارِ ذات کا منظر نامہ ایک ایسے وجود کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے، جو خواب اور خیال کی تعبیر کو خاک کے آنگن میں ایک نئے وجدانی شعور سے ہم کنار کرے، تاکہ

ذات اور اس کے آنگن میں اُبھرتے ہوئے تمام تر سلسلے وجود کی فکری تعبیر کو حسنِ خیال کی رعنائی سے مملو کر سکیں۔...... یہی وہ لمحہ ہے، جو ایک طرف ذات کو انکسار کے مقامِ فقر کی تجلیل عطا کرتا ہے (کہ یہ متصوفانہ راستے کا پہلا پڑاؤ ہے) اور دوسری طرف تخلیقی اظہارات کو خیال کی نئی تعبیر کے خوش کُن پیش نامے سے ہم آہنگ کر دیتا ہے، جس کی معنوی تعبیر غزل کے اُفق پر طلوع ہوتی ہے، اور یہی وہ نقطۂ اتصام ہے کہ جہاں سے افتخار عارف کی غزل آغاز ہوتی ہے۔...... دُعا کی تعبیر کا یہ تخلیقی الاؤ ان کی غزل کو زندگی کے تمام تلازمات سے بھر دیتا ہے اور یوں ان کی شخصیت انکسارِ ذات سے اثباتِ ذات تک ایک ایسے آہنگ کی غزل گوئی کی تخلیق کا سامان فراہم کرتی ہے، جو اردو غزل کے معاصر منظر نامے میں اپنی معنوی، تکنیکی اور فنی اعتبار سے سب سے الگ اور منفرد مقام کی حامل ہے:

> ''انسان اور تہذیب کے درمیان جو رشتہ قائم ہے، اس کی حیاتی معنویت کا ادراک ایک مخصوص زمان و مکان کے تناظر میں ممکن ہے، کیوں کہ علامت کی تہذیبی پس منظر میں فکری ترجمانی معنوی تہ داری سے عبارت ہے۔ فنا اور بقا کی منزلوں پر تجربے کی کیفیت نئے امکان کا پیش خیمہ ہے۔ کوئے فنا سے گزرے بنا، منزلِ بقا کا حصول تقریباً ناممکن ہے۔ چوں کہ اپنی ذات کی تلاش اپنے وجود کی اساسی فضا کو جانے بغیر مشکل ہوتی ہے، اس لیے انسان کے باطن اور اس کے خارج کے مابین فکری رابطے کی استواری بے حد ضروری ہے، ورنہ اپنی ذات کا ادراک اور عرفان نہیں ہو پاتا اور سالک اپنی انا کا شکار ہو کر اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتا ہے، یہاں تک کہ اثباتِ وجود کا مرحلہ بھی اس کی رسائی میں نہیں رہتا۔'' (۶۳)

یہ دُعا ہی تو ہے، جو افتخار عارف کے فکر و خیال کو پاکیزگی؛ حسنِ کلام کو رعنائی اور زندگی کو حصارِ عافیت کا قرینہ عطا کرتی ہے۔ اسی دُعا کی بدولت جب ان کی غزل میں رنگ و نور کی جمالیاتی اور طلسماتی فضا خوش کُن منظر نامے کی تخلیق کا جواز فراہم کرتی ہے، تو ہوا اور اس کے لہجے کی گھٹن،

آہنگِ دُعا کے باغیچے میں رنگارنگ پھول کھلانے اور دلوں کو وصلِ ذات سے شاد کرنے اور سالک کو شاہراہِ معرفت پر گامزن رکھنے میں معاون ہوتی ہے، کیوں کہ دُعا محض عمل ہی نہیں، طرزِ عمل بھی ہے؛ یہ وظیفہ حیات تو ہے ہی، ایک طریقِ حیات بھی ہے۔ اگر کوئی تخلیق کار دُعا کی چھتر چھاؤں میں پناہ گزیں ہو جائے، تو پھر اس کے تخلیقی وفور پر انوار کی رم جھم ہونے لگتی ہے:

کوئی تو پھول کھلائے دُعا کے لہجے میں
عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں

☆

دلوں کو جوڑتی ہے، سلسلہ بناتی ہے
ہر امتحاں میں دُعا راستہ بناتی ہے

☆

کسی گم گشتہ مسافر کی دعاؤں کا اثر
منزلیں گرد ہوئیں جادۂ ہموار کے پاس

☆

ہو کے دنیا میں بھی دنیا سے رہا اور طرف
دل کسی اور طرف، دستِ دُعا اور طرف

☆

دُعا کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
کبھی دُعا نہیں مانگی تھی ماں کے ہوتے ہوئے

☆

رود پہلے بھی پڑھتا ہوں اور بعد میں بھی
اسی لیے تو اثر بھی دُعا میں رہتا ہے

☆

کوئی فغاں، کوئی نالہ، کوئی بُکا، کوئی بین

کھلے گا بابِ مقفل دُعا کیے جائیں

افتخار عارف کی غزل دُعا کے جمالیاتی اسلوب سے عرفان کے رنگ کشید کرتی ہے اور یوں اس میں تخلیقی اثبات کی رعنائی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہم رنگ ہو جاتی ہے۔ اردو غزل کی فکری روایت میں دُعا اور اس کی تعبیر کا یہ رنگ افتخار عارف کی غزل سے مخصوص ہے، کیوں کہ ان کی غزل: خاک، خواب اور خیال کی استعاراتی اپیل سے اپنا فکری اور جمالیاتی مواد اخذ کرتی اور اسے اثباتِ وجود کی تازہ کاری اور حرمتِ لفظ کی تہ داری سے ہم آہنگ کرتی ہے۔

خواب اور خیال کی معنوی جمالیات تو اردو کے دیگر غزل گوؤں کے ہاں بھی وحدۃ الوجود کے فکری عناصر کی تعبیر و تفہیم کا لبادہ اوڑھ کر طلوع ہوتی رہی ہے، مگر خاک کی استعاراتی: کلید افتخار عارف کی غزل کو ایک ایسا رمزیاتی اسلوب عطا کرتی ہے، جو اردو غزل کے کینوس میں بالکل مختلف اور منفرد رنگوں کی جمالیات کا آئینہ دار ہے۔ لفظ ’خاک‘ کی علامتی جہت کو اوّل اوّل بابا فریدؒ نے اپنے اشلوک کی فکری اساس بنایا اور اسے چشتیہ سلسلے کی سچائی اور آفاقیت کے متنوع رنگوں کی تعبیر کا عکاس بنا دیا۔ یہ لفظ: ایک علامت اور ایک طرزِ فکر بن کر ان کی شاعری میں جلوہ گر ہوا، تو نصابِ چشت کا بنیادی اور اساسی فلسفہ اس ایک لفظ کے پیکر میں ڈھل گیا، کیوں کہ خاک کی بے رنگی، زندگی کی نے رنگی کی ترجمان بن گئی اور یوں چشت کا انکسارِ ذات اس ایک لفظ کے تناظر میں لو دے اٹھا۔ انکسارِ وجود سے اثباتِ وجود تک کے سارے رنگ اس کی معنویت سے ہم کنار ہوئے، تو سلسلۂ خیال کی تعبیر: عرفان اور معرفت کے ہمہ گیر رنگوں میں ڈھل گئی اور فکر و خیال کا یہ سلسلہ: زندگی اور اس کے بنیادی شعور کا وظیفۂ حیات بن گیا اور سلسلۂ چشتیہ میں یہ لفظ (خاک) تعبیر و عرفان کے مختلف اور متنوع مراحل کا عکاس ٹھہرا۔ پھر یہ لفظ...... محض لفظ نہ رہا، فکر و خیال کی رعنائی اور زندگی کے اسلوب کا ترجمان ہوا، جس سے بے رنگ اور بے کیف زندگی میں بہار آئی اور یہ رنگا رنگی سے ہم کنار ہوئی۔ خواب اور خیال کے قرینے خاک کے استعاراتی منظر نامے، ہم آہنگ ہوئے، تو خاک کی ہمہ گیری نے ان سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔......

بابا فریدؒ کے بعد یہ لفظ چشتی صوفیہ کی زندگی کا اسلوب بن گیا، لیکن تخلیقی اسلوب کی تہ داری اس لفظ

کی جمالیات کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے قاصر رہی۔..... پنجابی ادبیات میں کم کم اور کہیں کہیں اس کے رنگ اُترتے رہے، مگر اردو زبان اس کے جمالیاتی آہنگ سے تقریباً ناآشنا رہی۔

لے دے کر اقبال کے ہاں اس لفظ نے ایک آدھ جھلک دکھائی، مگر دلچسپ بات یہ کہ اس ایک آدھ جھلک نے ان کے ہاں جہانِ معنی کی تشکیل کے ہمہ رنگ زاویے بنائے اور فکر و خیال کے کتنے ہی منظر تخلیق کیے۔ جب مدینہ و نجف کی خاک ان کی چشمِ خیال کے لیے سرمہ بن گئی، تو بصیرت افروزی کے کتنے ہی باب ان کے حسنِ خیال میں جگمگا اٹھے۔ انھوں نے خاک کے ترفع اور عظمت کا صرف ایک منظر دکھایا اور اسی کو اپنی دامنِ چشم کے لیے محفوظ کر لیا۔ مدینہ و نجف کی خاک ان کی آنکھ میں سرمہ بن کر، ان کے شعور کی رعنائی کے منظر تراشنے لگی۔ خاک کی اس ایک جھلک نے ان کے خیال کی تابانی کو ایک نیا رنگ عطا کیا، جو تخلیقی منظر نامے میں، کسی استعاراتی اور علامتی رنگ میں ڈھلنے اور فکر و خیال کے آنگن میں ہمہ رنگ پھول اُگانے کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کا اُسلوب بھی بن گیا۔ اس ایک جھلک کی ترجمانی تخلیقی رنگوں میں ڈھلنے لگی اور ان کا سارا تخلیقی منظر نامہ اس کی روشنی سے جگمگا اٹھا، مگر ان کے ہاں اس کی کوئی اور جھلک دکھائی نہ دی اور اس طرح اردو غزل اس لفظ کے علامتی اظہارات سے محروم رہی، سوائے افتخار عارف کی غزل کے، کہ جس میں اس کے کتنے ہی رنگ طلوع ہوئے اور ان کی تابانی ان کے تخلیقی منظر نامے کا بنیادی اور کلیدی استعارہ بن گئی۔

دُعا سے پھوٹی ہوئی شاعری خاک کی تعبیر کا سراپا اوڑھ کر خواب اور خیال کے آفاق پر جلوہ گر ہونے لگی اور ذات کا منظر نامہ انکسارِ وجود میں ڈھلنے لگا۔ تنہائی کا احساس انکسارِ ذات کا پیکر اوڑھ کر چپ کے نہاں خانے میں کہیں گم ہو کر رہ گیا، جس سے اندر کا سکوت گہرا اور گہرا ہوتا گیا۔ چپ اور سکوت کی یہ گہرائی: جب تخلیقی جمالیات میں ڈھلنے لگی، تو ان کے لہجے کی انفرادیت کا رنگ نکھر کر ذرا اور چوکھا ہو گیا اور یوں ان کی غزل ...... ہند اسلامی تہذیب کے فکری مدار سے وابستہ ہوتے ہوئے مستقبل کے سویروں کی آئینہ دار بن گئی۔ اس رنگ اور آہنگ کی رعنائی: حسنِ خیال کی سچائی سے ہم رنگ ہو کر، فکری ہمہ رنگی، ہمہ گیری اور ہمہ جہتی کی دلیل بن گئی:

☆

میں ایک سلسلۂ آتشیں میں بیعت تھا
سو خاک ہوگیا نام و نشاں کے ہوتے ہوئے

☆

میں تو خاک تھا کسی چشمِ ناز میں آگیا ہوں تو مہر ہوں
مرے مہرباں کبھی اک نظر مرا سلسلہ بھی تو دیکھتے

☆

میں نے اک سلسلۂ نور میں بیعت کی تھی
حلقۂ نور میں پابندِ سلاسل ہوا میں

☆

کچھ نام جانتا ہوں، وہ کافی ہیں اور بس
یہ ساتھ ہوں تو کچھ ابد آباد تک نہ دے

☆

وردِ زباں رہیں انھیں نورانیوں کے نام
جب تک یہ خاک چادرِ امکان ڈھک نہ دے

☆

مٹی ہیں سو مٹی ہی سے رکھتے ہیں سروکار
آتے نہیں خورشید مزاجوں کے اثر میں

☆

عاجزی بخشی گئی تمکنتِ فقر کے ساتھ
دینے والے نے ہمیں کون سی دولت نہیں دی

☆

ہمیں تو بس یونہی جلنا ہے، خاک ہونا ہے!

چراغ کیا ہے ،دھواں کیا؟ ہمیں نہیں معلوم

☆

کوئی تو بات ہم آشفتگاں میں ایسی تھی

کہ خاک ہو کے بھی معیارِ آبرو ہوئے ہم

☆

افتخار عارف کے ہاں خواب ، خیال اور خاک کے استعارے اس طرح باہم جڑے ہوئے ہیں، کہ ان تینوں کے باہمی جمالیاتی آہنگ سے فکری اور معنوی رعنائی احساس کی ایک نئی فضا تعمیر ہوتی ہے۔ ان استعاروں کا انفرادی رنگ بھی موجود رہتا ہے اور اجتماعی حوالے سے ان تینوں کے معنوی ارتباط سے رنگ ونور کی وہ دنیا سامنے آتی ہے، جو فکر وخیال کے نئے نئے رنگوں میں گندھی ہوئی ہے۔ خواب اور خیال کی ماورائی حیثیت: خاک کی مادی تعبیر سے مل کر داخلی اور خارجی حوالے سے تخلیق کی ایک ایسی روایت کا آغاز کرتی ہے، جو انکسارِ وجود سے اثباتِ وجود اور یقین ذات تک کے تمام معاملات کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور یوں شاعر کا تمام تر فکری سرمایہ اس کے نظامِ فکر وعرفان کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ افتخار عارف کے ہاں خواب کی جمالیات اور اس کا معنوی پھیلاؤ، خیال کے مختلف اور متنوع رنگوں میں سانس لیتا ہے، اسی لیے ان کی غزل میں خواب کا منظر نامہ خوابیدگی کے پس منظر سے طلوع نہیں ہوتا، بلکہ اس کے معنوی اور فکری پس منظر میں بیداری کے سارے رنگ و آہنگ موجود رہتے ہیں۔ جب خواب ...... خوابیدگی کے بجائے بیداری کے عالم سے وابستہ ہو جائے، تو پیش منظر کے رنگ: باطن اور خارج کی باہمی یکجائی سے وابستہ ہو جاتے ہیں، جس سے غزل میں مابعد الطبیعیاتی رنگ تو اُترتا ہے ہی، اس میں طبیعیاتی حوالے بھی کھل اٹھتے ہیں اور یوں کسی بھی شاعر کے ہاں زندگی کے تمام تر رویوں کی رنگارنگی کا منظر سامنے آجاتا ہے:

بس ایک خواب جس کی حدیں دسترس میں ہوں

وہ بھی نہ دے، یہ خواب فلک در فلک نہ دے

☆

اک خوابِ دل آویز کی نسبت سے ملا کیا

جز در بدری اس درِ دولت سے ملا کیا

☆

یادوں سے اور خوابوں سے اور اُمیدوں سے ربط
ہو جائے تو جینے میں آسانی کرتا ہے

☆

اس تناظر میں افتخار عارف کی غزل بالکل نئے اور تازہ کار رنگوں کی عکاس بن جاتی ہے۔ ان کے ہاں خیال اور خواب کے استعاراتی آہنگ میں اسلامی اور ہند اسلامی تہذیب کا سارا ماضی اپنی تمام تر جمالیات کے ساتھ منعکس ہو جاتا ہے۔ ماضی کی اس بازگشت میں معنی آفرینی کے چراغ جل اٹھتے ہیں اور ان کی فکری تعبیر خواب کے عوامل کو اپنی گرفت میں لے کر نئے رنگ اور آہنگ کا اضافہ کرتی ہے۔ خیال کا استعاراتی آہنگ: ماضی کی باز آفرینی کو لمحۂ موجود کے پھیلتے سویروں کے ساتھ مربوط کر کے، اسے خواب کی ترجمانی کا فریضہ سونپ دیتا ہے، جس سے خیال اور خواب کی معنوی تعبیر کتنے ہی رنگوں کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اس ترجمانی کے دوران میں زندگی اور اس کا خارجی اور داخلی آہنگ موجود رہتا ہے، جس سے زندگی کی سچائی اپنے ہونے کی تعبیر کا سراپا اوڑھ لیتی ہے۔

افتخار عارف کی غزل: خواب وخیال کی اس طلسماتی فضا میں سانس لیتی ہے اور ان استعاروں کا جمالیاتی رنگ افتخار عارف کی غزل میں پروان چڑھتا ہے، جس سے ان کی تفہیم کے قرینے زندگی کے متنوع رنگوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر، ایک نئے طرزِ احساس کی بنیاد اٹھاتے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد کے الفاظ میں:

> ''وہ خواب بھی دیکھتے ہیں اور اُمید کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ ان کے دونوں مجموعۂ ہائے کلام میں خواب، اُمید اور نُور کا اتنا ذکر آیا ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں ہو۔ یہ ذکر کبھی صاف اور عیاں ہے اور کبھی مبہم وموہوم۔'' (۶۴)

افتخار عارف کی غزل میں خیال، خواب اور خاک کے استعاراتی رویوں کا فکری تعلق ان کے داخلی اور انفرادی طرزِ احساس سے بھی ہے اور اجتماعی اور خارجی تجربات کے ساتھ بھی۔ وہ خیال کی معنی آفرینی کو زندگی اور زندگی کے تمام تر معاملات کی تجرباتی اور مکاشفاتی رعنائی احساس کے تناظر میں اس انداز سے paint کرتے ہیں کہ زندگی کا حسن :حسنِ خیال کی تفہیم اور تعبیر کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے احساس یا خیال کے آنگن میں لہراتے یا ہیولے کی صورت میں پھیلتے ہوئے منظر کو اپنے تخلیقی وفور سے شعر میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے ہاں جب خیال کی رعنائی..... خواب کے پیش نظر میں مل کر، جلوہ گر ہوتی ہے، تو انسانی تجربات کے اجتماعی رنگ ان کے داخلی اور باطنی آہنگ کی سچائی سے مملو ہو کر، اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے کہ جہاں کسی بھی شاعر کی انفرادیت کے پھول کھلتے ہیں اور رنگ و بو کی دنیا میں اس کے شعری رویے: انسانی تجربے کے عکاس بن جاتے ہیں۔ اس مقام تک رسائی ہر کسی کا مقسوم نہیں ہوتی، ہو سکتی بھی نہیں، کیوں کہ خواب اور خیال کی استعاراتی جمالیات ہر شاعر کے تخیل کی خلاقی اور معنی آفرینی کا اظہاریہ نہیں ہوتی۔

افتخار عارف ان غزل گوؤں میں سے ایک ہیں، جو حسنِ خیال کی رعنائی کے رنگ رس کو کشید کرنے اور ان کی بوباس کو شعریت سے معمور کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور یہ ہنروری: شعریت کو عبارت اور اشارت کی خوش ادائی کے امتزاج سے ایک نئے طرزِ احساس کے خوش کُن منظرنامے سے ملا دیتی ہے اور یوں شاعر کے داخلی اور انفرادی تجربے: انسانی تجربوں میں ڈھل کر ہمہ گیر سچائی کے امین بن جاتے ہیں۔

خلقتِ شہر کو مژدہ ہو کہ اس عہد میں بھی
خواب محفوظ ہیں اک دیدۂ بیدار کے پاس
دیکھیے کھلتے ہیں کب انفس و آفاق کے بھید
ہم بھی جاتے تو ہیں اک صاحبِ اسرار کے پاس

☆

سچے سائیں ہمارے حضرت مہر علی شاہؒ

بابا! ہم نے گھر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

☆

یہاں کے لوگ اپنے خواب اپنے دل میں رکھتے ہیں
تمھارے شہر کی یہ اک ادا اچھی لگی ہم کو

☆

ہم بھی اس سلسلۂ عشق میں بیعت ہیں، جسے
ہجر نے دکھ نہ دیا، وصل نے راحت نہیں دی

☆

اے راہ روو! کچھ تو خبر دو کہ ہوا کیا
خوابوں کا خزانہ بھی تو تھا زادِ سفر میں

☆

حجابِ شب میں تب و تابِ خواب رکھتا ہے
درونِ خواب ہزار آفتاب رکھتا ہے

☆

آسمانوں پر نظر کر انجم و مہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

☆

خواب اور خیال کے استعاراتی تناظر میں خاک کی فکری جمالیات اپنی تہذیبی معنویت میں فکر وخیال کے جو دریچے وا کرتی ہے، ان کا تعلق مابعدالطبیعیاتی شعور سے بھی وابستہ ہے اور زندگی کے مادی اور خارجی رویوں کے ساتھ بھی۔.......... خاک کے استعاراتی رنگ کہیں سیاسی اور سماجی مسائل کی گرہ کشائی کرتے ہیں، تو کہیں ان کا سلسلۂ خیال: عرفان ویقین کے دائرہ در دائرہ پھیلتے ہوئے منظروں سے مل جاتا ہے اور اس طرح خاک کا لفظ معانی کا گنجینۂ اسرار بن کر سامنے

آتا ہے اور افتخار عارف کی غزل میں اس لفظ کی استعاراتی اپیل رنگ اور خوشبو کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ یہ رنگ کہیں تو سلسلۂ فکر و خیال کے آتشیں لبادے میں ملبوس ہو کر اظہار کی راہ پاتے ہیں اور کہیں ان کی نمود میں جمالیاتی آہنگ کا امتزاجی پہلو شامل ہو کر انھیں مٹی کے رنگ کا نقیب بنا دیتا ہے اور یوں خاک بے رنگی کے منظر نامے سے نے رنگی کے رنگ کشید کرنے لگتی ہے۔ خاک کبھی مٹی، کبھی زمین اور کبھی چادرِ امکان کے ہمہ رنگ رویوں کو اپنی گرفت میں لے کر اپنی معنویت کو کئی ابعاد میں منقسم کرتی ہے اور پھر اس تقسیم سے یکجائی اور اکائی کے منظر ابھارتی اور نئے رنگوں کی تشکیل کرتی ہے۔ خاک کا مٹی تک معنوی سفر جو سیاسی اور سماجی تناظر میں اُبھرتا ہے، وہ شعور کے اس مادی اور خارجی رویے کا ترجمان ہے، جو جغرافیائی تہذیب کے منظر نامے کو مرتب کرنے کا جتن کرتا ہے اور اس کی تعبیر زندگی کے ان پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، جو ملک کی محبت کے جغرافیائی منظروں کی عکاس ہوتی ہے۔...... مگر یہی خاک جب زمین کا سراپا اوڑھ لے، تو اس کی تعبیر اور تفہیم کے قرینے فرد اور قوم کے معنوی نظامِ فکر سے آگے بڑھ کر، انسانی رویوں کی اجتماعیت کا آہنگ مرتب کرتے اور انھیں اکائی کے تناظر میں دیکھنے کا منظر نامہ تشکیل دیتے ہیں:

☆

مالک سے اور مٹی سے اور ماں سے باغی شخص
درد کے ہر میثـــــــاق سے روگردانی کرتا ہے

☆

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

☆

زمیں کی دھوپ، زمانے کی دھوپ، ذہن کی دھوپ
ہم ایسی دھوپ میں بھی سائباں بناتے ہیں

مری زمیں مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو باروَر کر دے

☆

ہمیں میں رہتے ہیں وہ لوگ بھی کہ جن کے سبب
زمیں بلند ہوئی آسماں کے ہوتے ہوئے

☆

یہ فکری رویے انسانی زندگی کے مابعدالطبیعیاتی تجربے کی بو باس سے مل کر اثباتِ وجود کی نئی تعبیر مرتب کرتے ہیں، جس سے انسانی زندگی کا اجتماعی تجربہ: نئے طرزِ احساس کا گواہ بن جاتا ہے اور یہی طرزِ احساس: انسانی زندگی کو عجز و انکسار کی اس دولت سے مملو کرتا ہے کہ، جس سے بڑی دولت انسان کا مقسوم نہیں ہو سکتی۔ یہ دولت ایک طرف انسان کے فکری اور باطنی ترفع کی علامت ہے، تو دوسری اس کی مادیت کو اپنے دامنِ دل میں ڈھانپنے کا جتن کرتی اور اسے اپنی آغوش میں آسودگی سے ہمکنار کرتی ہوئی بھی دکھائی دیتی ہے۔

افتخار عارف کی غزل میں خاک کے استعاراتی آہنگ سے جنم لینے والے یہ سارے رنگ دِکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہاں رنگوں کی یہ آبشار فکر و خیال کی زمین کو تازہ اور شاداب رکھتی ہے، اس سے ان کے ذہن اور شعور کی تازگی اور بالیدگی کے منظر متشکل ہوتے ہیں، جو ان کی ذات کے نہاں خانوں کو انکسارِ وجود کی خوشبو سے بھر دیتے ہیں، جس سے ان کی شخصیت کا وہ رنگ سامنے آتا ہے، جو عاجزی اور انکسار سے عبارت ہے۔ اس رنگ و آہنگ کے امتزاج نے ان کے شخصی اظہارات کو بے نیازی، درویشی اور فقر کے نئے قرینے عطا کیے ہیں، جو ان کی غزل کو ان اظہارات کا آئینہ دار بنا دیتے ہیں۔

[۲]

افتخار عارف کی غزل کا ایک اور کلیدی استعارہ کربلا اور واقعاتِ کربلا کے فکری معاملات سے پھوٹا ہے۔ اس استعارے میں خواب اور خیال کے رنگ بھی ہیں اور خاک کی بو باس بھی۔ ان کے

شعری نظامِ فکر میں یہ استعارے معنوی جمالیات کی اکائی میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ ایک کی معنویت دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو پاتی۔ وہ اس سلسلۂ خیال میں ان استعارات کی تعبیر سے جہانِ معنی کی تشکیل کے ہمہ رنگ زاویوں کی ترتیب کرتے ہیں کہ جہاں ماضی کے منظر مستقبل کے پیش منظر سے مل کر ایک ایسی تہذیب کے آئینہ دار بن جاتے ہیں کہ جس میں کربلا اور اس کے متعلقات سے پھوٹتی ہوئی حریتِ فکر کی تعبیر لمحۂ موجود کے عصری منظرنامے کو سچائی اور صداقت کے احساس سے بھر دیتی ہے۔ این میری شمل رقم طراز ہیں:

> "The theme of suffering suffering for a noble cause, suffering in the hope that a positive meaning will emerge has been repeated throughout Islamic poetry for centuries... just as Husayn and his family suffered on the waterless battlefield. This theme runs through a large part of recent Urdu poetry, particularly that of Iftikhar Arif. He is modern in his use of language, but classical in the way he hides his burning concerns in allusions, symbols and metaphors.... an art perfected by classical Persian and Urdu poets.It allows the poet to voice his deepest concerns, hopes and fears in a form that is not time-bound but valid for every time and expresses(as Ghalib once said) what is in everyuone's soul(۶۵)

ہماری فکری اور ادبی روایت میں کربلا حق و صداقت کا وہ منشور ہے، جس سے اسلامی تہذیب کی چودہ صدیاں منور ہیں۔ تاریخ کے اس مقام سے آتی ہوئی روشنی نور کا ہالہ بن کر ہمارے احساس اور خیال کو خواب رنگ عرفان کی وہ تعبیر عطا کرتی ہے، کہ جس سے زندگی نہ صرف روحانی سطح پر ثمرور ہوتی ہے، بلکہ تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے بھی برگ و بار لاتی ہے۔ اصغر ندیم سید کے بہ قول:

''ہماری تاریخ کے ترکش میں ایک تیر ایسا بھی ہے، جو سچائی کی پیٹھ میں جا کر بجھتا نہیں ہے، ہر دور کے بیچ میں اس کی جڑیں مل جاتی ہیں؛ ہماری تاریخ کے پاس ایک شام ایسی بھی ہے، جو اتنی پھیلی کہ ہماری شامیں اس کے سائے میں آ گئیں؛ اسی طرح ایک خیمہ بھی ہماری تاریخ کے سینے پر تنا ہوا ہے، جس نے ہمیں بے گھر ہوتے اور دل کی زمین سے کوچ کرتے دیکھا ہے؛ اسی طرح ایک چراغ بھی تاریخ کی مٹھی میں ہے، جو دوستوں کی وفا کا امتحان لیتا ہے اور کم زور لوگوں کو لوٹ جانے کا مشورہ دیتا ہے؛ ایک دریا بھی ہے، جس کا پانی تاریخ میں کم اور شاعری میں زیادہ بہتا ہے ؛اسی طرح شاعری کے پاس ایک شہید بھی ہے، جو وعدہ بن کر پورے عصر میں سانس لیتا ہے کہ عاشق اور شہید لوٹ آتے ہیں، (یا) کم از کم شاعری اور گیتوں میں ضرور لوٹ آتے ہیں۔'' (٦٦)

تاریخ کی فکری یادداشت میں مذکور اس تیر، خیمے، چراغ اور دریا کی معنویت اور ان کے متنوع رنگ افتخار عارف کی غزل کے دریچوں سے لو دیتے دکھائی دیتے ہیں، کیوں کہ ان کی غزل میں خاکِ کربلا کے رنگ: خواب وخیال کے استعاراتی آہنگ سے مملو ہو کر اظہار کے فن کدے میں استعارہ در استعارہ پھیلتے منظروں سے اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ ان کی فکری اور جذباتی اپیل جمالیاتی پیکر تراش لیتی ہے۔ کربلا ہماری تہذیبی زندگی کا وہ استعارہ ہے، جس سے ہماری تاریخ وثقافت اور شعر وادب کے در و بام منور ہیں۔ یہ استعارہ ہمارے عصری ثقافتی، تہذیبی، انسانی، سماجی اور سیاسی مسائل کی گرہ کشائی کا عکاس بھی ہے اور ان کی مثبت اور خوب صورت تعبیر کے لیے مشعلِ راہ بھی۔ یہ وہ مینارۂ عرفان ہے، جس سے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے خدوخال روشن ہیں۔ یہ استعارہ سانحۂ کربلا کے المیاتی تناظر میں زندہ رہنے اور زندگی کو اجالنے کے لیے ایسے رویوں کو جنم دیتا ہے، جو خود تہذیبی زندگی کے لیے زندگی کی دلیل ہیں۔ گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں:

''واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات کا نئے سماجی انسانی مفاہیم میں استعمال یوں تو اوروں کے یہاں بھی ملتا ہے، لیکن افتخار عارف کے تخلیقی وجدان کو اس سے جو گہری مناسبت ہے، نئی شاعری میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ افتخار عارف کے یہاں یہ بات ان کے تخلیقی عمل کے بنیادی محرک کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ لمحۂ موجود کی پیچیدہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور انسانی صورتِ حال کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسے مرکزی کردار کا تصور ملتا ہے، جو مسلسل ہجرت میں ہے؛ عذابوں میں گھرا ہوا ہے؛ دربدر خاک بسر مارا مارا پھر رہا ہے اور کوئی دارالاماں اور جائے پناہ نہیں۔ ان کے یہاں بنیادی تاریخی حوالے سے جو پیکر ابھرتے ہیں، مثلاً: پیاس، گھرانا، گھمسان کا رن، بستی، بیاباں، قافلۂ بے سروسامان، یہ سب ثقافتی روایت کے تاریخی نشانات بھی ہیں اور آج کے عذابوں میں گھری ہوئی زندگی کے کوائف وظواہر بھی۔ ان کا شعری وجدان کچھ اس نوع کا ہے کہ ان کے اشعار صدیوں کے درد کا منظرنامہ بن جاتے ہیں اور ان میں وہ لطف وتاثیر بھی پیدا ہو جاتی ہے، جسے خداداد کہا گیا ہے۔'' (۶۷)

افتخار عارف نے اس زندگی بخش واقعے کو اپنی غزل کے لیے ایک استعاراتی آہنگ عطا کیا ہے۔ اس المیاتی سانحے کی تعبیر وتفہیم کے مناظر تو ہمارے مرثیہ گوؤں کے ہاں اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں، مگر اس کی استعاراتی اپیل کو شعروادب میں مرتب کرنے اور اس کی وساطت سے زندگی کو معنی آفرینی بنانے کا ہنر پہلی بار اقبال نے برتا ہے، جن کے کلام میں اس واقعے کے علامتی اور استعاراتی حوالے نئے رنگوں سے مزین ہوئے ہیں۔ کربلا کی اس نئی معنوی فضا میں اقبال نے اپنی تخلیقی اپج کا جو ثبوت فراہم کیا ہے، اس کے رنگوں کی ہنرکاری سے مزین بالکل نئی اور منفرد دنیا: افتخار عارف کی غزل میں بھی دکھائی دیتی ہے، جنھوں نے اس

استعارے سے اپنی غزل کا بنیادی اسلوب نکھارنے میں اہم کام لیا ہے۔ ان کی غزل میں اس استعارے کی بدولت ایک ایسی روشنی طلوع ہوئی ہے، جس سے صنفِ غزل کے آفاق جگمگا اٹھے ہیں۔ انھوں نے غزل کو کربلا کے پس منظر سے لفظی اور معنوی سطح پر ایک نئے اسلوبِ اظہار اور گنجینۂ معانی کے فن کدے سے روشناس کرایا ہے۔ کتنی ہی تراکیب: کربلا اور اس کے متعلقات کی روشنی میں ڈھل کر رنگ و نور کا ہالہ بن گئی ہیں، جو اردو غزل کی روایت میں افتخار عارف ہی سے مخصوص ہیں۔ ان الفاظ و تراکیب نے پیکر تراشی کے عمل کو فنی اور فکری جمالیات سے بھی ہم آہنگ کیا ہے، جس سے داستانوی لحن کا اسلوبیاتی رنگ ایک نئے وژن اور ادراک کی تمثال کاری سے وجود پذیر ہوا ہے۔ انھوں نے اس استعارے اور اس کے ضمنی لفظی آہنگ [چراغ، ترکش، دریا، تیر، مشکیزہ، شام، پیاس، دشت، مسافر، اذان، غبار وغیرہ] سے لسانی پیکر تراشنے اور انھیں تہذیبی سطح پر فکری اور معنوی جمالیات کے منظر سے ملانے کا بھی جتن کیا ہے۔ افتخار عارف کی غزل میں کربلا اور متعلقاتِ کربلا کے حوالے سے استعاراتی آہنگ کے کچھ رنگ ملاحظہ ہوں، کہ ان کی غزل کس طرح دکھ، درد اور کرب کے اس ماحول سے زندگی کے بام و در اُجالنے اور اس کی تعبیر کو نئے رویوں میں متشکل کرنے میں کامگار ہوئی ہے:

حسینؑ! تم نہیں رہے تمھارا گھر نہیں رہا
مگر تمھارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

☆

زمیں سے آسماں تک نور تھا بس نور ہی نور
چراغوں کے مقابل جب ہوا رکھی گئی تھی

☆

حصارِ ظلم کے نرغے میں سرخرو ترے لوگ
حدودِ وقتِ معین سے ماورا، ترا غم

☆

ایک چراغ اور ایک کتاب اور ایک امید اثاثہ
اس کے بعد تو جو کچھ ہے، وہ سب افسانہ ہے

☆

سیاہِ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگارِ شب نکلا

☆

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خُدا کے لہجے میں

[۳]

خوف، تنہائی اور کرب: افتخار عارف کی غزل کے موضوعاتی کینوس کو عصری حسیّت اور سماجی شعور سے بھر دیتے ہیں، خوف کی فضا نے ان کی غزل کے آہنگ کو حیرت سے مملو کر دیا ہے۔ ان کی ذات کی کا کرب اور دکھ ایک مخصوص خوف کی بنا پر در آتا ہے اور شعر کی فضا کو ایک ایسی معنوی تہ داری عطا کرتا ہے، جس کی بدولت ان کا خوف اور کرب ذاتی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی رنگوں کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ دکھ اور کرب کی عکاسی نے ان کی غزل کو ان کے عہد کا نوحہ بنا دیا ہے، جس سے ان کے کلام میں عصری رویے اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ تنہائی: شخصی سطح پر حصارِ ذات کا ایک ایسا المیہ ہے، جو کسی بھی فرد کو اپنے باطن کی دنیا میں محصور کر کے شکستِ اعتبار کے رنگوں کو اُجالتا ہے، جس سے فرد کی ذات گہری چُپ اور اس چُپ کے نتیجے میں سکوتِ ذات کی ہم کلامی سے متصف ہو جاتی ہے۔

افتخار عارف کی غزل کے یہ موضوعاتی آہنگ کسی نوعیت کی منفیت کو جنم نہیں دیتے، بلکہ ایک ایسی خواب ناک فضا مرتب کرتے ہیں، جو اداسی میں ڈھل کر معنوی تہ داری کا سراپا اوڑھ لیتی ہے۔ پروین شاکر نے لکھا ہے کہ:

”تنہائی عارف کی ذات کا دکھ بھی ہے اور اس کے عہد کا بھی۔ عارف

نا گزیت کی اس سفا کی سے نبرد آزما ہے۔ وہ سرما کی طویل راتوں میں
دیواروں پر انہونی باتیں لکھ دیتا ہے اور گرمی کی طویل دوپہروں میں دم بہ خود
سناٹے میں اپنے وجود کو چیختے ہوئے دیکھتا ہے۔ شاموں کے سکوت سے
گھبرا کر سخن طرازانِ شہر کی محفلوں میں پناہ لیتا ہے، مگر اس کے اندر کی چُپ
اتنی گہری ہے کہ کسی صدا سے نہیں ٹوٹتی۔ سو ایک بار پھر، یہ جاگتی آنکھوں
والا شاعر، نئی خواب زمینوں کے سفر میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔'' (۶۸)

اپنے باطن سے نکل کر خارج کی سطح پر شاعر کا زندگی سے مکالمہ، غزل کو نئے تیوروں سے مملو کرتا ہے، کیوں کہ اپنی ذات کے نہاں خانے میں گہری چُپ اور باہر کے موسموں سے ہم کلامی کا رنگ: زندگی کے رویوں کو متضاد، مگر زندگی سے بھرپور رنگ رس کو امتزاجی اسلوب کی رعنائی کا قرینہ عطا کرتا ہے، جس سے زندگی اور اس کے رنگ اپنے تمام تر جمالیاتی اظہار کا سراپا اوڑھ کر سامنے آتے ہیں، کیوں کہ جب:

> ''ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی تھکن اور اُبھرتے ہوئے چاند کی روپہلی مسکراہٹ کے درمیان، ٹھہرے ہوئے دکھ کی ایک تحیر زدہ ساعت، شہرِ بے مہر کے ایک تنہا مسافر سے ہم کلام ہوئی اور اس کی صندل کی بانسری سے اداسی کا پہلا گیت پھوٹا، (تو) یوں بے نکہت موسموں نے اپنی نمو کی نوید سن لی۔ بے صدا ساعتوں کے لیے، اجر کے اس وعدے کا نام افتخار عارف ہے۔ افتخار عارف، جو بیک شب، شہرِ تذبذب کے ساکنوں میں حرفِ دعا کی طرح محبوب ہوگیا۔'' (۶۹)

[۴]

ہجرت بھی افتخار عارف کی غزل کا ایک اہم موضوع ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس موضوع نے اردو ادبیات کی مختلف اصناف میں بہ طورِ خاص جلوہ نمائی کی ہے۔ غزل میں ناصر کاظمی اور

منیر نیازی کی وساطت سے ہجرت کا موضوع ایک خاص رنگ اور آہنگ سے در آیا ہے، مگر افتخار عارف کے ہاں اس کی معنوی اپیل ناصر کاظمی، منیر نیازی اور ان کی نسل کے شعرا سے بالکل مختلف اور منفرد ہے۔ ناصر کے ہاں ہجرت کا المیہ ایک ایسی فضا بناتا ہے، جو قیامِ پاکستان کے فکری تناظر سے ہوتی ہوئی ہجرتِ مدینہ کے رنگ ونور سے جاملتی ہے۔ ان کے برعکس افتخار عارف کے ہاں ہجرت کا تصور سیاسی اور سماجی مسائل کے پیش منظر سے گندھ کر کربلا کے پس منظری ماحول تک پھیل گیا ہے۔ اس میں ہجرت کا تاریخی تناظر بھی ہے اور عصرِ جدید کے المیاتی رنگ بھی۔ اور ان المیوں کی نقاب کشائی ان کی غزل میں متنوع رنگوں میں عکس انداز ہوئی ہے۔ ہجرت کا مذہبی پہلو اپنے اندر نظریے اور عقیدے کی فکری آدرش لیے ہوئے ہے، اس میں روحانی سطح پر، آگے بڑھنے اور بلند ہونے کی قوت اور صلاحیت بھی موجود رہتی ہے اور اس کے دیگر مظاہر بھی اپنی فکری معنویت کے ساتھ فرد اور قوم یا ملت کی زندگی میں در آتے ہیں۔ ہجرت کے معاشرتی اور سیاسی رنگ مذہبی پہلوؤں سے ہٹ کر وقوع پذیر ہوتے ہیں، تو ان کی معنویت بھی ان مسائل کے مطابق اپنی معنویت کے رنگوں کو نمایاں کرتی ہے۔ ہجرت کے مختلف مسائل اور معاملات اپنے رویوں میں معانی کی مختلف اور متضاد سطحوں کو عکس انداز کرتے ہیں۔ شاہین مفتی کے نزدیک:

> ”(ہجرت کی) جو صورتیں بیسویں صدی میں ظہور پذیر ہوئی ہیں، وہ اپنی نوعیت اور شدت میں جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ اختیاری ہجرت خواہ وہ بہتر معاشی مستقبل کے لیے ہو، یا کسی تہذیبی آدرش اور نظریۂ حیات کی خاطر...... اپنی بنیاد میں مکمل طور پر اختیاری نہیں ہوتی۔“ (۷۰)

ہجرت اختیاری ہو یا غیر اختیاری...... مذہبی ہو یا سیاسی...... فرد کا انفرادی تجربہ ہو یا اجتماعی تجربہ...... اس میں المیاتی رنگ موجود رہتے ہیں۔ افتخار عارف کے ہاں اس تجربے کی معنویت مذہبی آہنگ سے بھی وابستہ ہے اور اس کے سرے معاشرتی رویوں کے ساتھ بھی جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے یہ شعر دیکھیے، جو اس موضوع کو مختلف اور متنوع رنگوں کے تناظر میں اجاگر کرتے ہیں:

نتیجہ کربلا سے مختلف ہو یا وہی ہو
مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا

☆

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

☆

اک ہماری بھی امانت ہے تہِ خاک یہاں
کیسے ممکن ہے کہ اس شہر سے ہجرت کریں ہم

☆

اک ہجرت اور ایک مسلسل در بدری کا قصہ
سب تعبیریں دیکھیں گے کوئی خواب نہیں دیکھے گا

☆

ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

☆

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

[۵]

افتخار عارف کی غزل کی عمومی فضا دینی، تہذیبی اور ثقافتی حوالوں سے مزین ہے۔ وہ دینی روایت سے جڑے ہوے شاعر ہیں ان کے کلام میں مذہبی اور متصوفانہ رویے تخلیقی آہنگ کی تاب اور توانائی سے مملو ہو کر منعکس ہوتے ہیں۔ ان کی غزل میں حمدیہ، نعتیہ اور متصوفانہ اشعار کی

جمالیاتی معنویت فکر و فرہنگ کا ایسا اشاریہ مرتب کرتی ہے، جو شاعر کی فکری معنویت کا غماز ہے۔ ان کے کلام میں تیقن کی فضا اور ان کے لہجے کی فکری رعنائی ان کے دینی طرزِ فکر سے پھوٹی ہے۔ وہ گمان اور تشکیک کے صحراؤں میں زندہ رہنے کے بجائے یقین اور ایمان کے موسموں میں زندگی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی یہی ترجیح ان کے کلام کے اسلوب کو تازگی اور شادابی کی اس فضا سے ہم آہنگ رکھتی ہے، جو مذہبی تہذیب سے مستنیر ہوئی ہے۔ اقبال کے بعد کوئی بھی دوسرا شاعر، اس حوالے سے ان کا مدِ مقابل نہیں ہوسکتا، کیوں کہ انھوں نے مذہبی حوالوں کو شعری تہذیب سے ہم آہنگ کر کے انھیں تخلیقی اثبات کا جامہ پہنایا ہے اور یوں ان کے ہاں صداقتِ احساس اور رعنائیٔ فکر و خیال کے دیپ جل اٹھے ہیں۔ یہ چراغ...... اس روایت اور تہذیب کی روشنی سے وابستہ ہیں، جو مدینہ و نجف کے دبستانِ فکر و عمل کی سچائی کی آئینہ دار ہے۔ پروفیسر فتح محمد ملک کے بہ قول:

> ''افتخار عارف انحراف کے زمانے میں اثبات کا شاعر ہے۔ جس زمانے میں مسلمانوں کی ادبی اور فکری روایت سے بے رخی سکۂ رائج الوقت تھا، عین اس زمانے میں افتخار عارف نے ہماری اپنی ادبی و فکری روایت کی تردید کے چلن سے بغاوت کر کے مسلمانوں کی انسان دوستی، روشن خیالی اور ترقی پسند ادبی و فکری روایت کے تخلیقی اثبات کا رویہ اپنایا۔ میں افتخار عارف کے اس فنی نقطۂ نظر کو تاریخی اور تخلیقی ہر دو اعتبار سے ایک کارنامہ خاص قرار دیتا ہوں۔'' (۱۷)

پروفیسر صاحب نے بجا طور پر افتخار عارف کو اثبات کا شاعر قرار دیا ہے، کیوں کہ ان کی بصیرت افروزی نے انھیں در بدر بھٹکنے اور مختلف اور متنوع ازموں سے نیم سچائی کا اکتساب کرنے اور اس کے نتیجے میں صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمرہی کا شکار ہونے سے بچائے رکھا اور ان کے فکر و شعور کو ایسی وجدانی اور مکاشفاتی سچائی سے ہم کنار کیا، جس کی بدولت ان کے کلام میں تخلیقی

زرخیزی کے رنگ رس نمایاں ہوئے۔ حمدیہ اور نعتیہ اشعار کے منظرنامے میں متصوفانہ اشعار کے رنگ دیکھیے کہ کس طرح ان کا مذہبی اور روحانی احساس تخلیق کے نئے موسموں کا حوالہ بن گیا ہے:

یقیں کا ورد وظیفہ نہ اسمِ اعظمِ عشق
تو پھر یہ کیسے کھلے گا طلسمِ سینۂ خواب

☆

کبھی خزاں میں کھلاتا ہے رنگ رنگ کے پھول
کبھی بہار کو بے رنگ و آب رکھتا ہے

☆

نمودِ نُور ہے اور غیب سے شہود میں ہے
مری دُعا کی جزا خود مرے درود میں ہے

☆

نمودِ خواب کی باتیں، شکستِ خواب کا ذکر
ہمارے بعد یہ قصے کوئی کہے گا نہیں

☆

بوند میں سارا سمندر، آنکھ میں کل کائنات
ایک مشتِ خاک میں سورج کی آب و تاب دیکھ
شب کو خطِ نُور میں لکھی ہوئی تعبیر پڑھ
صبح تک دیوارِ آیندہ میں کھلتے باب دیکھ

[۶]

افتخار عارف کی غزل لفظ اور معانی کے باہمی ارتباط سے رنگ، نور اور خوشبو کی فضا بندی کرتی

ہے، تو اس سے ان کے لہجے کی انفرادیت: ندرتِ ادا اور جدتِ فکر کی رعنائی سے معمور ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں لفظ اپنے تہذیبی اور جمالیاتی پس منظر میں معانی کا طلسم کدہ بن جاتا ہے اور لفظ کے بھید ان کے سینۂ دل پر منکشف ہونے لگتے ہیں۔ وہ لفظ کے انتخاب میں اپنے جمالیاتی ذوق کی چاشنی سے اخذ و استفادہ کرتے ہیں، تو معنی کی تخلیق کا ایک نیا اور تازہ کار زاویہ جنم لیتا ہے، جس سے ان کی آواز کے مختلف اور متنوع رنگ: تاب اور توانائی سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ وہ لفظ کو برتنے اور اس کے طلسماتی آہنگ سے روشنی اور رنگ کشید کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی غزل اپنی ڈکشن کی منفرد اور مختلف صوری اور معنوی جمالیات کے اعتبار سے عصری منظر نامے میں بالکل الگ ذائقے کی حامل ہے۔ ان کی ڈکشن، جب تہذیبی اور تاریخ کی فکری معنویت کے تناظر میں ماضی کی اُوٹ سے چہرہ نمائی کرتی ہے، تو یہ ایک علامتی اور رمزیاتی آہنگ کی نقیب بن جاتی ہے۔ ایسے میں لفظ تلمیحاتی رنگ سے آگے بڑھ کر علامت اور استعارے کی بُکل مارتے دکھائی دیتے ہیں، جس سے ان کے ہاں لفظ: معانی کی کتنی ہی سطحوں پر ہم کلام ہو جاتے ہیں۔ لفظوں کے متنوع shades کو برتنے اور ان سے معانی کی نئی دنیا تشکیل دینے کا اسلوب ان کا خاص اسلوب ہے۔ وہ لفظ کو اسلامی تہذیب کے فکری اور معنوی منظر نامے سے ہم آہنگ کر کے خواب و خیال کی ایک ایسی فضا تعمیر اور ترتیب دیتے ہیں کہ جس کی بدولت لفظ طاقِ دل پر رکھے وہ چراغ بن جاتے ہیں کہ جس کی روشنی حال کے منظر نامے سے گزر کر مستقبل کے دریچوں کو اُجالنے لگتی ہے۔ لفظ و معانی کی یہ اقلیم ان کی ہنر کاری کی بدولت مشرق کی ادبی روایت کی امین ہے۔ ان کے لفظ یاس زدگی کی اس فضا میں اُمید، یقین اور رجائیت کے علم بردار ہیں۔

افتخار عارف لفظ کے انتخاب میں اتنے محتاط ہیں کہ ان کے کلام میں کوئی بھی لفظ ان کی فکر کے بنیادی اور اساسی نظام سے متصادم یا اس کے متخالف نہیں ہے۔ وہ اداس اور خوف زدہ معنوی پس منظر سے لفظ اٹھاتے ہیں، مگر اس کی تہذیب اور ترتیب میں اُمید و یقین کی ایسی شمعیں فروزاں کر دیتے ہیں کہ لفظوں کی اداسی زندگی کے مثبت امکانات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ کربلا اور اس کے

متعلقات سے اُبھرنے والے سارے لفظ اداسی، غم اور دکھ کی کیفیات کے غماز ہیں، مگر افتخار عارف نے ان کے معنوی تناظر میں حریتِ فکر، اُمید و یقین، ہمت و حوصلہ اور اثباتِ وجود جیسے معنوی رویوں کو اُجالنے کی سعی کی ہے، جو یقیناً مشکور اور قابلِ ذکر ہے، کیوں کہ اس سے زندگی کی مثبت قدروں کے امکانات جگمگا اُٹھے ہیں۔ لفظ اور معانی کے جمالیاتی ارتباط نے افتخار عارف کی غزل کو ایک نئے آہنگ کی نوید دی ہے۔ یہ آہنگ، جو حرف و صورت کے باہمی امتزاج سے سُر تال اور اس کے زیر و بم سے ترتیب پاتا ہے، ان کی غزل میں ان کے شخصی اور داخلی اسلوب سے مل کر ایک ایسے نظام کو جنم دیتا ہے، جو اپنے اندر موسیقی کے مدھر سُر بھی لیے ہوئے ہیں اور اس میں تیور سروں کی بھی کمی نہیں۔ مدھر اور تیور سُر تال مل کر، یا متوازی چلتے ہوئے ان کے شعوری لہجے یا اُسلوب کی تشکیل میں کارفرما رہتے ہیں اور یوں ان کا آہنگ، ان کے باطن کی خوش ادائی سے مل کر ایسے صوتی زاویے مرتب کرتا ہے، جو اردو کے شعری لحن میں ایک نیا اور تازہ اضافہ ہے۔ انھوں نے بحر و اوزان کے انتخاب میں بھی اپنے داخلی اسلوب سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور اس سے ان کے لہجے کے رنگ، ان کے فطری آہنگ کی ہم رنگی سے مزین ہو کر ان کی پہچان اور شناخت کا سبب بن گئے ہیں۔ فکری اور معنوی حوالوں کے برعکس ان کی غزل اپنی ڈکشن، تراکیب، حرف و صوت کی ہم آہنگی، لفظ و معانی کی یک جائی اور اسلوب کی تازہ کاری کے حوالے سے بھی علاحدہ شناخت کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ان مراحل کی فضابندی میں اپنی تخلیقی اپج کا ثبوت دیا ہے، کیوں کہ وہ فن کی اس نزاکتِ احساس سے آگاہ ہیں، جو لہجے کی فنی اعتبار سے آہنگ کی رعنائی کا قرینہ عطا کرتی ہے، تو مملکتِ لفظ و بیاں میں ان کی دسترس کا اسلوب نکھر آتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے خیال میں:

> ''افتخار عارف کے پہلے مجموعے 'مہرِ دو نیم' اور 'حرفِ باریاب' کے درمیان دس سال، ایک براعظم، ہزاروں میل کی مسافتیں، چند چاند چہرے، ایک خوابِ نیم روز اور خود افتخار عارف حائل تھے۔ یہاں تک پہنچنے میں انھیں

دنیا کا سب سے لمبا سفر طے کرنا پڑا، یعنی حصارِ ذات سے نکل کر زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے اور جو کچھ دیکھا ہے، وہ دوسروں کو دکھانے کی سعی مسلسل، جو فنی اظہار و ابلاغ کی اصل غایت ہے۔ اس سفر نے ان کے لہجے کو نئی تاب و توانائی بخشی ہے۔ وہ اپنی بات جم کر کہتے ہیں۔ پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ کہیں کہیں طیش و ملال سے آواز بھر آتی ہے، مگر اس کی گونج اور گمک نہیں جاتی۔ عجز کا اظہار بھی کرتے ہیں، تو اپنی کلاہ کو کج ہی رہنے دیتے ہیں۔ مزاجاً ان کا ادبی رشتہ یگانہ سے ملتا ہے۔ وہ عزتِ نفس اور سربلندی کے شاعر ہیں۔ ان کا آہنگ رجزیہ اور لہجہ احتجاجی ہے۔ ان کے ہاں صرف تراکیب اور ڈکشن کا شکوہ ہی نہیں، لہجے کا شکوہ اور ایک شائستہ فنِ شعلگی اور ہمہمہ بھی ہے۔ ان کا لہجہ ان کے حرف کا اعتبار اور سمپورن ٹھاٹ ہے۔ جب لفظ اپنی چھل بل دکھا کر، اپنا جانا پہچانا مفہوم بیان کرنے کے بعد ہاتھ باندھے چُپ کھڑے ہو جاتے ہیں، تب لہجہ بولنے لگتا ہے۔ پھر اس کے اُتار چڑھاؤ، گونج گرج اور مدھم ٹھاٹ اور گندھار سے معانی اور اشارت کے نئے سوتے اور نئی دھیان دھارائیں پھوٹ نکلتی ہے۔ پھر شاعر اپنے باغِ معانی کی بہار دکھاتا ہے۔" (۷۲)

حریمِ لفظ و معانی سے افتخار عارف کی نسبت عرضِ ہنر کے سلیقے سے جنم لیتی ہے۔ وہ لفظ کو اس ہنرمندی سے استعمال کرتے ہیں کہ یہ معانی کے متنوع رنگوں کا خزینہ بن جاتا ہے۔ لفظ کی مزاج شناسی اس وقت تک دسترس میں نہیں آتی، جب تک کہ کوئی بھی شاعر اپنے کلاسیکی سرمائے کی فکری، فنی اور تکنیکی جمالیات سے آگاہ نہ ہو، لیکن جب وہ لفظ کا مزاج داں ہو جائے، تو پھر لفظوں کو اپنے کلام میں نگینے کی صورت جڑ دیتا ہے۔

افتخار عارف کے کلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ لفظ کو برتنے اور اس کے متنوع معنوی

ابعاد کو اُجالنے کے ہنر سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ لفظوں کی مرصع سازی ان کے شاعرانہ اسلوب کا خاص وصف ہے۔ انھوں نے لفظ و معانی کے مابین نسبتیں تلاشنے میں بھی ہنروری کا کمال دکھایا ہے اور تراکیب سازی کے حوالے سے بھی اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے، کیوں کہ الفاظ اور تراکیب کے بھید اس وقت شاعر کے سینۂ دل پر سچائی بن کر اترتے ہیں، جب وہ ان کے پس منظر میں موجود معنویت کی فکریات کو پرکھنے کے فن سے آگاہ ہو، بہ صورتِ دیگر شاعر کی ڈکشن اور اس کے فکری نظام کے مابین توازن کی عدم موجودگی اس کے فن کو متاثر کرتی ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ افتخار عارف کے ہاں لفظ کے انتخاب اور تراکیب سازی کی ہنروری کے ضمن میں ان کا وجدان ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ انھوں نے تراکیب سازی اور لفظ و معانی کے باہمی ارتباط سے اپنے شاعرانہ اسلوب کو نئے معنیاتی آہنگ سے روشناس کرایا ہے، جس کی بدولت ان کی آواز میں ایک قوت اور توانائی در آئی ہے۔ سلیم احمد کے خیال میں:

> ''افتخار عارف میرے لیے ایک انتظار کا نام ہے۔ ایک شاعر کا انتظار جسے میں پورے آدمیوں کی فہرست میں رکھ سکوں۔ اپنی نسل کے شعرا میں وہ سب سے سنجیدہ شاعر ہیں اور اپنے مواد اور فن دونوں میں ایک ایسی پختگی کا اظہار کرتے ہیں، جو دوسروں میں نایاب نہیں، تو کم یاب ضرور ہے۔
>
> افتخار عارف کی شاعری ایک ایسے شخص کی شاعری ہے، جو سوچنا، محسوس کرنا اور بولنا جانتا ہے، جب کہ اس کے ہم عصروں میں بیشتر کا المیہ یہ ہے کہ یا تو وہ سوچ نہیں سکتے، یا وہ محسوس نہیں کر سکتے اور سوچ اور احساس سے کام لے سکتے ہیں تو بولنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ ان کی ان خصوصیات کی بنا پر جب میں ان کے کلام کو دیکھتا ہوں، تو یہ احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ افتخار عارف کی آواز جدید اردو شاعری کی ایک بہت زندہ آواز ہے؛ ایک ایسی آواز جو ہمارے دل و دماغ دونوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہمیں ایک

ایسی آسودگی بخشتی ہے، جو عارف کے سوا شاید ہی کسی ایک آدھ شاعر میں مل سکے۔'' (۷۳)

حسن خیال کے انتخاب اور لہجے کی اسلوب سازی تک افتخار عارف نے کئی شاعروں سے اخذ واستفادہ کیا۔ انھیں پڑھتے ہوئے میر، آتش، انیس، اقبال، یگانہ اور فیض کی آواز کسی دور دیس سے آتی سنائی دیتی ہے، مگر یہ آوازیں افتخار عارف کی آواز کو مبہم یا مدہم نہیں کرتیں۔ ان کے لہجے کا سُر تال ان کی اپنی انفرادیت سے جنم لیتا ہے۔ وہ دوسروں کی آواز سے اپنی آواز کے زیروبم اُبھارنے کا جتن نہیں کرتے، بل کہ مختلف اور ہمہ رنگ آوازوں کے تناظر میں اپنے ریاض سے اپنی آواز کا رنگ ابھارتے اور نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے لہجے کا تیقن انھیں اپنے معاصر غزل گووں سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ ان کے تخلیقی اثبات نے ان کے اسلوب اور شعری لہجے کو ایک ایسا لحن عطا کیا ہے، جو ان کی غزل کی تازگی اور توانائی کا باعث بھی ہے اور اس کی فنی جمالیات کا امین بھی۔ ان کا فنی شکوہ ایک طرف ان کے اسلوب کو نئے معنیاتی نظام سے وابستہ کرتا ہے، تو دوسری طرف ان کے لہجے کو جمالیاتی شناخت عطا کرتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے بہ قول:

''افتخار عارف کا لہجہ بڑا رسا ہوا ہے۔ شعری لفظیات کے اعتبار سے وہ اپنا منفرد انداز رکھتے ہیں۔ سجا ہوا، نکھرا نکھرا، الفاظ کا ایک طلسم خانہ۔ غزل ہو یا نظم ان کا لہجہ اور آواز الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہ افتخار عارف کا افتخار ہے کہ انھوں نے غزل کے اس لہجے اور زبان کو جو عمومیت کی گرد میں دبی جا رہی ہے، سنوارا اور نکھارا ہے؛ نیا رنگ و آہنگ دیا ہے اور اس کی ادبی قامت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔'' (۷۴)

وہ 'نظم' کیا جو رقم ہو تو روشنی بھی نہ ہو

افتخار عارف کی نظم کا فکری و فنی مطالعہ

افتخار عارف کی نظمیں روایت اور تہذیب کی خوشبو میں گندھی ہوئی ہیں۔انھوں نے اپنی اکثر نظموں کا مواد: اسلامی تاریخ اور روایت کے باطن سے اخذ کیا ہے۔ان میں تہذیب کے رنگ اپنی تمام تر جمالیات کے ساتھ منعکس ہوئے ہیں۔کربلا اور اس کے متعلقات سے پھوٹنے والی روشنی ان کی نظموں کے بین السطور حسنِ خیال اور رعنائی احساس کے چراغ روشن کر رہی ہے۔اس سے ان کی نظمیں بہ یک وقت ماضی کی طرف مراجعت بھی کرتی ہیں اور حال کے منظرنامے پر عصری مسائل کی ترجمانی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نزدیک:

> ''افتخار عارف کے لاشعور میں ظلم و تعدی، بے زمینی و بے گھری، بے حرمتی و تباہی اور بربادی، نیز منافقت، مصلحت اندیشی اور الم و مدہ کی سچائی و اصلیت کا سارا منظر نامہ اپنی گونا گوں استعاراتی و علامتی کیفیات کے ساتھ اس حد تک پیوست ہے کہ ان کا پورا احساسِ اظہار اس میں ڈوبا ہوا ہے۔'' (۷۵)

ان نظموں کا موضوعاتی اور معنیاتی منظرنامہ: دینی اور تہذیبی رنگوں کی کوملتا سے متشکل ہوا ہے۔ افتخار عارف نے اپنی نظم کی تخلیق میں دینی رویوں کی جمالیاتی تعبیر کو اس طرح آمیخت کیا ہے کہ ان کا شعری منظرنامہ مذہبی اور تاریخی پس منظر کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔یہ پس منظر ہمارے تاب ناک ماضی کا گواہ بھی اور ہمارے روشن مستقبل کا آئینہ دار بھی۔ان کی نظموں کے اکثر و بیشتر کردار: اسلامی تاریخ اور تہذیب کے وہ روشن اور تاب ناک مینارہ ہائے نور ہیں، جن سے

ہمارے فکری، دینی اور روحانی شعور کی تازگی قائم ہے۔ ان مقدس شخصیات کا کردار اور عمل ہمارے فکری اور باطنی ترفع کے لیے ایک ایسا نمونہ فراہم کرتا ہے، جس سے روشنی، رنگ اور خوشبو کے استعارے جنم لیتے ہیں۔ اکبر حمیدی لکھتے ہیں:

''افتخار عارف نے جہاں اپنی محبوب شخصیتوں کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے، وہاں یہ بات بہت قابلِ ذکر ہے کہ یہ سب شخصیتیں اپنے عہد میں بھی عظمتِ کردار کی علامت تھیں، لیکن افتخار عارف نے ماضی کی ان شخصیتوں کے عظیم کردار کو اپنے عہد کا نیا حوالہ دیا ہے اور اپنے عہد میں ان کرداروں کی عظمت کو ایک قابلِ تقلید مثالیت کی شکل دی ہے۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے زمانوں میں اپنے اپنے حلقۂ زندگی میں درجہ بہ درجہ ایک ہیرو کی حیثیت سے زندہ رہے اور اپنے اپنے کردار میں ہیرو ہی کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔ بے شک زمانے تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں اور حالات و واقعات کی لہریں پیش منظر میں تبدیلیاں بھی لاتی رہتی ہیں، لیکن عظیم کرداروں کی بازگشت کہیں نہ کہیں ہمیشہ سنائی دیتی رہتی ہے۔ وقت اس بازگشت میں کمی تو کر سکتا ہے، لیکن اس آواز کو خاموش نہیں کر سکتا۔'' (۷۶)

[۲]

افتخار عارف کی نظموں میں موضوعاتی اور فکری مواد کی کشید کا سارا عمل: اسلامی تہذیب کے معنوی دھارے سے خوشبو کی تعبیر اور تفسیر کے رنگ سمیٹنے سے عبارت ہے۔ وہ اپنی غزلیہ شاعری سے زیادہ اپنی نظموں میں اپنے نظریاتی طرزِ احساس کی جمالیات کو منعکس کرنے میں کامگار ہوئے۔ علاّمہ اقبال کے بعد، افتخار عارف سے زیادہ کسی بھی دوسرے اردو شاعر کی شاعری اپنے فکری اور نظریاتی تیقن اور اثبات کی علمبردار نہیں رہی۔ انھوں نے اپنی تہذیبی روایت کے جن کرداروں سے محبت کی، یا جنھیں اپنی فکری اور روحانی زندگی کے لیے نمونہ بنایا، وہ ان کے تخلیقی تجربے کا حصہ بن گئے۔ ان کے ہاں صداقتِ احساس کے قرینے اسی اثباتی تعبیر سے عکس انداز

ہوئے اور ایک نئے رنگ کی جمالیاتی اور وجدانی شاعری کی بنیاد بن گئے۔ محمد اظہار الحق افتخار عارف کی شاعری کے اس خاص فکری تناظر کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شاعری اداکاری نہیں۔ شاعری تو وہ اصل زندگی ہے، جو شاعر بسر کرنا چاہتا ہے۔ وہ جو کچھ ہے، شاعری ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ افتخار عارف نے یہی کیا ہے۔ وہ جو کچھ ہے، بغیر کسی احتیاط کے اور بغیر کسی لومتہ لائم کے خوف کے اپنی شاعری میں در آیا ہے۔ اسے اس کی کوئی پروانہیں کہ لوگ کیا کہیں گے اور اس پر کون سی چھاپ لگائیں گے؟ اس کا جس چیز پر ایمان ہے، اس نے اسے اپنی شاعری کے اندر حلول اور اپنی شاعری کے اوپر محیط کر دیا ہے۔ یہی اس کی چھتری ہے، جو اس نے سر پر تانی ہوئی ہے؛ یہی اس کا لباس ہے، جو اس نے زیبِ تن کیا ہوا ہے؛ یہی اس کے اندر کی توانائی ہے، جس کے بل بوتے پر وہ کھڑا ہے؛ یہی اس کی پہچان ہے اور اسی لیے وہ الگ کھڑا ہے۔ اس کی چھتری دور سے نظر آ رہی ہے اور اس کا لباس اس کا اپنا ہے۔'' (۷۷)

(۳)

افتخار عارف کے سارے کلام میں ایک نظم ہے، جو اپنے اندر فکری اعتبار سے حمدیہ آہنگ رکھتی ہے۔ دیوانِ غالب کی غزلِ اوّل کی طرح افتخار عارف نے بھی اپنی اس حمدیہ نظم میں استفہامی تناظر میں گمان اور واہمے سے اثباتِ یقین کی طرف سفر کیا ہے۔ انھوں نے تشکیکی پیرایۂ اظہار سے اثباتی طرزِ احساس تک جو باطنی اور روحانی سفر کیا ہے، اس میں صدیوں کے تجسس اور تجربے کی بُو باس بھی شامل ہے اور ان کے انفرادی مشاہدے اور معنوی منظرنامے کے رنگ بھی۔ ان کے استفہامیہ لہجے کے سارے رنگ نظم کے پیکر کو معنوی اعتبار سے رعنائی احساس کی وجدانی بیل سے مملو کر کے، یقین کی خوشبو سے اس طرح آمیخت کرتے ہیں کہ نظم کا فکری پیرایۂ اظہار یہ ایک ایسے رنگ میں ڈھل جاتا ہے، جو اپنی اصل میں بے رنگی کا استعارہ ہے، مگر جب یہ بے رنگی،

رنگوں کی آبشار بناتی ہے، تو جہانِ معنی کے طلسماتی منظر: فکری تعبیر کی جمالیاتی سچائی کا سراپا اوڑھ لیتے ہیں۔ بے رنگی کی رنگوں میں نمود 'ہوا کے پردے' میں پنہاں اس وحدت کا اظہار یہ بن کر سامنے آتی ہے، جو کبھی 'چراغ کی لو' تو کبھی 'وقت کی رو' اور کبھی 'رمزِ نور کے حجاب میں پرتو' سے کھیلتا ہے اور جب یہ وحدت مذکورہ رنگوں میں عکس انداز ہوتی ہے، تو کثرت اور تعنیات کے فکری منظر ناموں اور وجدانی موسموں کی نوید بن جاتی ہے۔ بہ قولِ ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"یہ سوالات بیشتر ذہنی الجھنوں کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ان سوالوں کے پس پردہ افتخار عارف کے یہاں زندگی کی مثبت قدروں کی فتح مندی کا یقین بھی خاصا نمایاں ہے اور یہی یقین انھیں مایوسی کی گہری کھائی میں گرنے سے بچالے جاتا ہے۔ چنانچہ ہزار الجھنوں کے باوجود شاعر کو یقین ہے کہ سوال کرنے والے کی اوٹ میں کوئی ہے ضرور......اور جب 'ہے' تو پھر 'نہیں ہے' کے خوف سے لرزنا بے معنی سی بات ہے۔" (۷۸)

اس تناظر میں افتخار عارف کے یہ سوالات، اپنے بین السطور موجود جواب کی سچائی کی جمالیاتی اپیل کو منعکس کرتے ہیں:

تو کون ہے وہ جو لوحِ آبِ رواں پہ سورج کو ثبت کرتا ہے
اور بادل اچھالتا ہے
جو بادلوں کو سمندروں پہ کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں
خورشید ڈھالتا ہے
وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ، رنگ میں روشنی
کے امکان رکھنے والا
وہ خاک میں صوت، صوت میں حرف، حرف میں زندگی
کے سامان رکھنے والا
نہیں کوئی ہے

کہیں کوئی ہے

کوئی تو ہوگا

گمان اور تشکیک کے منظرنامے سے آغاز کرتی یہ نظم اپنے اختتام تک پہنچتی ہوئی ایک صوفیانہ تجربے کی سچائی سے مل کر نئے معنیاتی اسلوب کی تشکیل کرتی ہے۔ جب یہ صوفیانہ عرفان: تشکیک کے جنگل سے گزر کر فطرت کے وسیع تر منظر اور خوش رنگ موسم کے جمالیاتی صوت و آہنگ کے تناظر میں اثباتِ وجود کی جمالیاتی صداقتِ احساس سے مل جاتا ہے، تو معرفت کی معنوی تعبیر: مکالماتی طرزِ اظہار میں طلوع ہوتی ہے، جس سے شاعر کے باطن میں خود کلامی کے رنگ ایک ایسے فکری نظام کی تشکیل کرتے ہیں، جو وجود کی اکائی کو کثرت کے تعیناتی اعتبارات کا اظہاریہ فراہم کرتے ہیں اور یوں وہ وحدۃ الوجودی صداقتِ فکر و خیال: اعتبارات اور ممکنات کے تعینات کا اشاریہ بن کر صدہا سوالات کی اساس بن جاتی ہے۔ سوالات میں بکھرتے اور پھیلتے رنگوں کی تعبیر میں ڈھلتے یہ استفہامیے: اکائی اور بے رنگی کی بے کراں تنزیہاتی تعبیر اور تشبیہاتی تفسیر کے اسلوب میں متشکل ہو جاتے ہیں، جس سے خود کلامی کے رنگ مکالماتی گنجینۂ اسرار کے فن کی نمود کا منظرنامہ مرتب کرتے ہیں، جو ہماری فکری اور تہذیبی زندگی کا ایک بنیادی اور اساسی اشاریہ ہے۔ اس مکالماتی سچائی سے ایک طرف عقل: جستجو کا سراپا اوڑھ کر تشکیک اور گمان کے فکری تلازموں میں اظہار کی راہ پاتی ہے، تو دوسری طرف عشق: حضور و اضطراب کی معنوی جمالیات کا استعارہ بن جاتا ہے، جس سے بے رنگی کے رنگ...... نیرنگی کے سویروں کی تہذیب کرتے اور اسے طرزِ احساس کی جمالیات اور نئے جہانِ فکر و خیال کی تعبیر کا اظہاریہ بنا دیتے ہیں۔

افتخار عارف کی یہ نظم جہاں ایک طرف ان کے ذہن کے تشکیکی اور اثباتی زاویہ ہائے خیال کی ترجمان ہے، وہیں ان کی شاعری کے فکری اسلوب کا تعین بھی کرتی ہے۔ ان کے کلام میں یہ واحد نظم ہے، جس میں تشکیکی زاویۂ خیال کی عقلی اور فکری تعبیر ملتی ہے، کیوں کہ ان کی بقیہ تمام نظمیں ان کے اثباتی طرزِ احساس کی خوشبو سے معطر ہیں۔ اس نظم کے اثباتی اور یقینی رنگوں کی تعبیر ان کے کلام کے معنوی رنگوں کی جمالیات کو عرفانِ رسولؐ کی روشنی سے مستنیر کرتی ہے، جس سے اسلامی

تہذیب اور روایت کا شعور...... ان کے ہاں فکری تعبیر اور معنوی جمالیات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ اس نظم کے تناظر میں پھوٹتی ہوئی روشنی: رنگ ونور کا ہالہ بناتی ہوئی مدینہ ونجف کے روحانی ضابطۂ حیات کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔

[۴]

افتخار عارف کی تمام نعتیہ نظمیں اسی اثباتی سچائی اور صداقتِ احساس کے نور سے معمور ہیں، کیوں کہ وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ زیرِ آسمان اس وادیٔ نور سے نازک تر آستانہ کہیں اور موجود نہیں۔ جہاں مکالمہ رنگوں کی تعبیر کا اشاریہ نہیں ہوتا، بلکہ خوشبو کا احساس ہی زندگی اور اس کے تمام تر معنوی اور فکری معاملات کو نور اور روشنی کی تعبیر عطا کرتا ہے۔ بہ قول محمد اظہار الحق:

> ''افتخار عارف نے حمد اور نعت کے جوہر (Essence) کو اپنی تمام شاعری پر پھیلا دیا ہے۔'' (۷۹)

اس جوہر نے جہاں افتخار عارف کی شاعری کو فکری اور معنوی اعتبار سے ثروت مند کیا ہے اور وہیں ان کی تخلیقیت کو بھی ہنروری کے کتنے ہی رنگ عطا کیے ہیں۔ دینی اور تہذیبی روایت کے فکری اور وجدانی استعارے اگر تخلیقی تجربے کی خوشبو کا سراپا اوڑھ لیں، تو پھر شاعر کے ہاں ماضی، حال اور مستقبل کے مابین زمانے کی رواکائی کے تناظر میں تشکیل پذیر ہوتی ہے، جس سے وقت کا الہیاتی اور جمالیاتی آہنگ تخلیق کو زندہ رہنے کا احساس فراہم کرتا ہے، جو زمانوں کے ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی اسلوب کا لبادہ پہن کر باطنی شعور کی آفاقیت کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ اس سے تخلیقی وفور کے سوتے ایک طرف گنجینۂ معنی کا طلسم کدے بن کر، ابدیت کی ترجمانی سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، تو دوسری جانب تخلیق کار کی وجدانی کیفیت: تہذیبی اور فکری تناظر میں ایک اجتماعی تجربے کی معنویت سے ہمکنار ہو پاتی ہے۔ اس سے ایک ایسے مقامِ اتصال کی نوید ملتی ہے، جس تک پہنچ کر شاعر اپنے عہد سے ماورا ہو کر، کئی زمانوں کے اجتماعی شعور اور وجدان کا نمائندہ قرار پاتا ہے، کیوں کہ آفاقی سچائی کی تعبیر جس قدر متنوع اور ہمہ گیر رویوں سے مربوط

ہوتی ہے، اسی قدر شاعر کا شعری تجربہ: اس کی تخلیقی کائنات کی وسعت آشنائی کا پتا دیتا ہے۔
سید ضمیر جعفری رقم طراز ہیں کہ:

''میرے نزدیک یہ ایک ایسا شاعر ہے، جس کی صلاحیت اس کے اختیار میں ہے اور وہ خود اپنی جینیئس (Genious) کے اختیار میں ہے۔عمر اور تجربہ جس کا حصار نہ کر سکیں اور فنون اور محبتوں کی صدیاں جس کے خون میں دوڑ رہی ہوں۔ گویائی اگر ایک تہذیب ہے، تو مہرِ دو نیم اور حرفِ باریاب ہماری تہذیبی اثاثوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں احتجاج تو ہے، مگر نفرت نہیں ہے؛ جذباتیت ہے، مگر ایسی نہیں کہ خوبی و خرابی میں تمیز نہ کر سکے؛ قدامت پسندی ہے، مگر ویسی نہیں، جو ساٹھ برس کی عمر میں آدمی میں عموماً خود بہ خود آ جاتی ہے، نہ مجھے اس کے ہاں ویسی لبرل شاعری نظر آئی، جو سولہ برس کی عمر میں لکھی جاتی ہے۔ میرے نزدیک افتخار عارف کمرے کا شاعر ہے، 'کمیون' (COMMUNE) کا شاعر نہیں؛ یہ بادلوں کی شاعری ہے، بدلیوں کی شاعری نہیں۔ بے شک خال خال بادل ایسے بھی ہیں، جو ہمارے سیاسی لیڈروں کی طرح گرجتے زیادہ اور برستے کم ہیں، مگر ان کی جو بوند زمین تک آ جاتی ہے، چٹانوں کا دل چیر دیتی ہے۔ اپنے پورے کینوس (Canvas) میں یہ کچھ ایسے شبہات و سوالات کی شاعری ہے، جن سے یقین محکم ہوتا ہے اور دانش فروغ پاتی ہے۔ آرٹ کی ان آفاقی قدروں کو جمہوریت کے عوامی پیرایوں سے پرکھنا نہ درست ہوگا، نہ مناسب۔ اس کا جذبہ جالب کے ساتھ ہے اور اسلوب غالب کے ساتھ۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے کلچر کو عام بھی کیا اور بلند بھی رکھا اور تہذیب کے دریا کو طغیانی کے باوجود کناروں سے چھلکنے نہیں دیا۔'' (۸۰)

کلچر اور تہذیب کی جمالیاتی اور فکری معنویت: افتخار عارف کی نظم کا بنیادی اور اساسی قرینہ مرتب کرتی ہے۔ ان کا شعری نظام تہذیبی روایت سے عبارت ہے۔ وہ اپنے فکری نظام اور موضوعاتی رویوں کی تابناکی کے اعتبار سے معاصر شعری منظرنامے پر بالکل مختلف اور منفرد انداز سے طلوع ہوئے ہیں۔ ان کی نظموں کا اثباتی اور رجائی اسلوب ان کی اپنی دینی اور تہذیبی روایت پر اعتبار اور یقین کے تناظر میں متشکل ہوا ہے۔ ان کی وہ تمام نظمیں جو دینی اور ملی روایت کے علمبرداروں کے جمالیاتی اور روحانی نظامِ فکر سے وابستہ ہیں، اپنے اندر ایقان اور یقین کے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں، کیوں کہ انھوں نے اپنی شاعری کا بنیادی اسلوب عرفانِ رسولؐ کے جمالیاتی آہنگ اور فکری طرزِ احساس کی کوملتا سے مملو کر کے خوش رنگ موسموں کی بازآفرینی سے مرتب کیا ہے، جس کی مہک ابدیت کی ترجمان ہے:

> ''یوں افتخار عارف نے اقبال کی انقلابی شاعری سے اردو شاعری کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑ کر ایک نئے انداز کی ترقی پسند شعری روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ وہ عصرِ حاضر میں معاشی اور معاشرتی عدم مساوات اور سیاسی جبر و استبداد کی ترویج میں ہمہ تن منہمک قاہر و جابر قوتوں کو للکارتے وقت اسلامی تاریخ سے جس طرح روشنی اور قوت اخذ کرتے ہیں، اس کی بہترین مثال ابوذر غفاریؓ اور اسامہ بن زیدؓ پر ان کی نظمیں ہیں۔ اپنے انقلابی مسلک سے پھوٹتی ہوئی ان نظموں میں افتخار عارف نے بے شک ان تاریخی شخصیات سے اپنی اٹوٹ محبت کی بنا پر اعتنا کیا ہے، مگر خدا لگتی کہتا ہوں کہ انسانی تاریخ کے علاوہ دنیائے انسانیت کے اصنامِ خیالی میں بھی ان انقلابی تصورات کی مکمل تجسیم کہیں اور نہیں ملتی۔ 'ابوذر غفاریؓ کے لیے ایک نظم' کا آخری حصہ بتاتا ہے کہ یہ نظم ابوذر غفاریؓ کے لیے نہیں، بلکہ میرے آپ کے لیے اور میری آپ کی آئندہ نسلوں کے لیے ہے:

☆

جبینِ وقت پر لکھی ہوئی سچائیاں روشن رہی ہیں
تاابد روشن رہیں گی
خدا شاہد ہے اور وہ ذات شاہد ہے کہ جو وجہِ اساسِ انفس و آفاق ہے
اور خیر کی تاریخ کا وہ بابِ اوّل ہے
ابد تک جس کا فیضانِ کرم جاری رہے گا
یقیں کے آگہی کے روشنی کے قافلے ہر دور میں آتے رہے ہیں
تاابد آتے رہیں گے
ابو طالب کے بیٹے حفظِ ناموسِ رسالت کی روایت کے امیں تھے
جان دینا جانتے تھے
وہ مسلمؑ ہوں کہ وہ عباسؑ ہوں عونؑ و محمدؑ ہوں علی اکبرؑ ہوں قاسمؑ ہوں علی اصغرؑ ہوں
حق پہچانتے تھے
لشکرِ باطل کو کب گردانتے تھے
ابو طالبؓ کے بیٹے سر بُریدہ ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں
ابو طالبؓ کے بیٹے پا بجولاں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں
ابو طالب کے بیٹے صرفِ زنداں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں

☆

اسلامی انسان دوستی کے مثالی تصورات کو نامساعد ترین حالات میں اپنی اور اپنے عصر کی عملی زندگی میں جلوہ گر دیکھنے کی تمنا میں حضرت ابوذرؓ نے جس استقامت، ایثار اور عشقِ رسولؐ کی مثال پیش کی ہے، افتخار عارف اسے عصرِ رواں اور زمانِ آئندہ کو جبر و استعداد سے نجات دلانے کے جہاد میں سرچشمۂ فیضان سمجھتے ہیں۔ اسی طرح رنگ و نسل کے جاہلی تعصّبات سے عہدِ حاضر کو آزاد دیکھنے کی تمنا افتخار عارف کو اس دانائے سبل،

ختم الرسل، مولائے کلؐ کے انقلابی کردار کی ایک بار پھر تحسین کرنے پر مجبور کر دیتی ہے، جس نے غبارِ راہ کو فروغِ وادیٔ سینا بخشتا تھا، یعنی جس نے گری پڑی اور ٹھکرائی ہوئی مخلوق سے محبت کو اللہ کی عبادت کا بلند ترین درجہ قرار دیا تھا اور جس نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو جو ایک آزاد کردہ غلام تھے، لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا۔ عرب قبائل کے ممتاز ترین نمائندوں کو ان کی اطاعت پر مجبور کیا اور یوں انھیں نام نہاد سردارانہ نخوت سے رہا کر کے انسانی مساوات کی عملی تربیت دی تھی۔ نظم کا آخری حصہ آپ کو خود ہی سب کچھ بتا دے گا، تو لیجیے پڑھیے:

اب بھی نخوت ہے وہی جبہ و دستار کے بیچ
وہی معیارِ شرف درہم و دینار کے بیچ
اک غلام ابنِ غلام ابنِ غلام ابنِ غلام
اب بھی نرغے میں ہے اک شہرِ دل آزار کے بیچ
نرغۂ اہلِ تکبر سے نکالے مجھ کو
کوئی صدیقؓ نہیں ہے کہ بچالے مجھ کو!

☆

جب افتخار عارف ہمارے زمانے کی نئی جاہلیت کی قاہر و جابر قوتوں کو للکارتے وقت کسی ابوذرؓ، کسی صدیقؓ اور کسی حسینؑ کے نئے ظہور کی تمنا کرتے ہیں، تو ان کی شاعری اقبال کی شاعری کو آواز دینے لگتی ہے:

''وہی حرم ہے وہی اعتبارِ لات و منات
خدا نصیب کرے تجھ کو ضربتِ کاری!'' (۸۱)

تاریخی اور تہذیبی مسائل اور شخصیات، عصری زندگی کے آلام اور ان کی جبریت اور ذاتی اور شخصی رویے: افتخار عارف کی نظموں کے بنیادی موضوعات ہیں۔ یہ موضوعات نئے نہیں اور نہ ہی افتخار عارف سے مخصوص ہیں، لیکن ان کی فکری اپیل اور معنوی Treatment افتخار عارف کی اپنی ہے۔ انھوں نے محولہ بالا تینوں موضوعات کو اپنے ذاتی مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں اپنی فکری اور معنوی بصیرت سے اس طرح بیان کیا ہے کہ ان عمومی رویوں میں بھی ان کی انفرادیت کے رنگ نکھر کر اپنی تمام تر جمالیاتی تہذیب کے ساتھ متشکل ہوئے ہیں۔

تاریخی اور تہذیبی مسائل اور شخصیات کا استعاراتی آہنگ صرف ماضی اور اس کی فکری روایت تک محدود نہیں رہا، بلکہ یہ ان کے عصری منظرنامے کے ساتھ بھی اس طرح جڑے ہوئے ہیں، کیوں کہ ان کی شاعری میں روایت کی تہذیب اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ منعکس ہوئی ہے۔ کربلا اور اس کے فکری اور معنوی معاملات ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہیں۔ یہ موضوع اردو اور فارسی شاعری کا ایک روایتی موضوع رہا اور اب بھی ہے۔ بیسویں صدی سے قبل اور علامہ اقبال کے شعری ظہور سے پہلے، یہ موضوع زیادہ تر مرثیے کی صنفِ سخن سے مخصوص تھا۔ مرثیے میں کربلا اور اس کے تہذیبی آثار کا بیان واقعاتی روایت کے ساتھ وابستہ رہا۔ علامہ اقبال نے پہلی بار اس موضوع کے حرکی تصور کو مسلمہ امہ کے فکر و عمل کی اساس ٹھہرایا اور اس کے تناظر میں عصری مسائل کی عارفانہ توجیہہ بیان کر کے اسے ایک نئی حسیت کا نقیب بنا دیا۔ افتخار عارف تک پہنچتے پہنچتے یہ حسیت نئی شعری روایت اور آفاقی ادب کے اسلامی شعور اور شناخت کی پہچان بن گئی۔

نام نہاد ترقی پسند آفاقی ادب کے منظرنامے میں دینی، مذہبی اور اسلامی شعور اور روایت کی اس آمیخت کو ہمیشہ سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے، حالاں کہ تاریخ کے آنگن میں تخلیق کاروں کا یہ فکری سفر اپنے خارجی ماحول کے ساتھ ساتھ داخلی عوامل سے بھی وابستہ رہا اور یوں خارج اور داخل کے مابین ایک نقطۂ اتصال کی تہذیب سے یہ دینی اور آفاقی رویے اسلامی شناخت کا نشان بنتے گئے اور ان سے تخلیقی وجدان کی معنویت اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہی اور اس

طرح ہند اسلامی تہذیب کی روایت: کربلا کی اس نئی فکری معنویت سے ہمارے اجتماعی خوابوں کی تعبیر بن کر رونما ہوئی۔ خواب اور خیال کی یہ جمالیاتی تفسیر نئے شعری آفاق کی ترجمان بن گئی اور یوں علامہ اقبال کے بعد افتخار عارف کا کلام اس تہذیبی معنویت کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ ان کے تخلیقی منظر نامے پر اس تہذیبی روایت کی رم جھم جاری رہی۔ عمومی طور پر ان کے سارے مجموعہ ہائے کلام اور شہرِ علم کے دروازے پر بطورِ خاص ان کے اس جمالیاتی آہنگ اور معنویت کا ترجمان ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

☆

کبھی کبھی خود چراغ کی لَو یہ چاہتی ہے
کہ ایک سرکش ہوا کا جھونکا اِدھر بھی آئے
جو رات آنکھوں میں چھپ رہی ہے نظر بھی آئے
پھر اس اندھیرے میں ہر مسافر کو جادۂ خیر کے کبھی دیں پناہ یاد آئیں
اپنے مہر اپنے ماہ یاد آئیں
وہ یاد آئیں کہ جن کے انوارِ قدس کی بارشوں میں کونین اپنا گرد و غبار دھولیں
وہ یاد آئیں کہ جن کے ناموں کے اسمِ اعظم کی روشنی ہو تو سنگ بولیں
حجابِ اکبر اُٹھے تو سرِّ وجود کھولیں

☆

جبینِ وقت پر لکھی ہوئی سچائیاں روشن رہی ہیں
تا ابد روشن رہیں گی
خدا شاہد ہے اور وہ ذات شاہد ہے کہ جو وجہ اساسِ انفس و آفاق ہے
اور خیر کی تاریخ کا وہ بابِ اوّل ہے
ابد تک جس کا فیضانِ کرم جاری رہے گا
یقیں کے، آگہی کے، روشنی کے قافلے ہر دور میں آتے رہے ہیں
تا ابد آتے رہیں گے

ابوطالبؑ کے بیٹے حفظِ ناموسِ رسالت کی روایت کے امیں تھے
جان دینا جانتے تھے
وہ مسلمؑ ہوں کہ وہ عباسؑ ہوں، عونؑ و محمدؑ ہوں، علی اکبرؑ ہوں، قاسمؑ ہوں، علی اصغرؑ ہوں
حق پہنچانتے تھے
لشکرِ باطل کو کب گردانتے تھے
ابوطالبؑ کے بیٹے سر بُریدہ ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں
ابوطالبؑ کے بیٹے صرفِ زنداں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں
ابوطالبؑ کے بیٹے صرفِ زنداں ہو کے بھی اعلانِ حق کرتے رہے ہیں

☆

فَاذکُرُونی اَذکُرکُم

(تو تم یاد رکھو مجھ کو، میں یاد رکھوں گا تم کو)

کچھ شعر مکۂ مکرمہ کے لیے

منزلِ ذکر میں ہر شہر پہ چھائے ہوئے شہر
کیا ثنا ہو تری قرآن میں آئے ہوئے شہر

میرے آقاؤں کے مسکن ، مرے اللہ کے گھر
میرے نبیوں کی دعاؤں میں بسائے ہوئے شہر

زمزم و کوثر و تسنیم، تسلسل تیرا
چشمۂ خیر کا فیضان اُٹھائے ہوئے شہر

ایک بوسے کی اجازت حجرِ اسود پر
اے مرے نُور کی بارش میں نہائے ہوئے شہر

خاک ہم رتبۂ افلاک ہوئی جن کے سبب
اُن کی آواز سے آواز ملائے ہوئے شہر

☆

مرا شرف کہ تُو مجھے جوازِ افتخار دے
فقیرِ شہرِ علم ہوں زکوٰۃِ اعتبار دے

میں جیسے تیسے ٹوٹے پُھوٹے لفظ گھڑ کے آ گیا
کہ اب یہ تیرا کام ہے بگاڑ دے سنوار دے

مرے امین آنسوؤں کی نذر ہے قبول کر
مرے کریم اور کیا ترا گناہگار دے

نگاہداریِ بہار آرزُو کے واسطے!
ہمارے نخلِ جاں کو بھی کوئی نگاہدار دے

ترے کرم کی بارشوں سے سارے باغ کِھل اُٹھیں
ہوائے مہر نفرتوں کا سارا زہر مار دے

قیامتیں گزر رہی ہیں کوئی شہسوار بھیج
وہ شہسوار جو لہُو میں روشنی اُتار دے

وہ آفتاب بھیج جس کی تابشیں ابد تلک
میں داد خواہِ اجر ہوں جزائے اِنتظار دے

☆

مدینے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا
جلال ایسا کہ دل سینے سے نکلا جا رہا تھا

مثالِ فردِ عصیاں تھی کتابِ عمرِ رفتہ
کوئی مجھ میں تھا جو صفحے اُلٹتا جا رہا تھا

بلاوے پر یقیں تھا اور قدم اُٹھتے نہیں تھے
عجب سیلِ الم آنکھوں میں اُمڈا آ رہا تھا

ہر اک بولا ہوا جملہ ، ہر اک لکھّا ہوا لفظ
لہو میں گونجتا تھا اور قیامت ڈھا رہا تھا

اور ایسے میں اُسی اک نام نے کی دستگیری
وہی جو منتہائے ہر دُعا بنتا رہا تھا

بہت نامطمئن آنکھیں اچانک جاگ اُٹھیں
کوئی جیسے دلِ کم فہم کو سمجھا رہا تھا

مدینہ سامنے تھا ، منتظر تھا درِ سخی کا
دلِ آزردہ اپنے بخت پر اِترا رہا تھا
دُعا بعد از دُعا ، سجدہ بہ سجدہ ، اشک دَر اشک
میں مشتِ خاک تھا اور پاک ہوتا جا رہا تھا

(۶)

عصری زندگی کے مسائل اور معاملات افتخار عارف کی نظم کا دوسرا بڑا موضوع ہیں۔ انھوں نے اس موضوع کو اپنے ذاتی آثار سے اجتماعی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ ان کے اس فکری رویے کی

حامل دو منتخب نظموں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے، تا کہ ان کے معنوی تناظر میں ان کی نظموں کے موضوعاتی کینوس اور وجدانی احساس کا تعین کیا جا سکے:

(۱) محبت کی ایک نظم

یہ نظم ان کے کلام میں اپنی فکری جمالیات اور داخلی کیفیات کے اعتبار سے بالکل منفرد جذبوں کا اظہاریہ ہے۔ اس نظم میں جو تجربہ بیان ہوا ہے، وہ بہت ہی کم ان کے غزلیہ شعروں میں بھی در آیا ہے۔ اس میں ذاتی جذبوں کی سچائی: طرزِ اظہار کی رعنائی کے ساتھ مل کر ایک ایسی صورت میں منکشف ہوئی ہے، جو ان کے دلی جذبات اور احساسات کا اشاریہ ہے۔ نظم کا موضوعاتی کینوس ذاتی تجربے کی کوملتا سے معمور ہے۔ انھوں نے محبت کے اس تجربے کو اپنی غزل میں بھی گنتی کے چند ہی شعروں میں بیان کیا ہے، لیکن وہاں رمز و علائم کے طلسماتی سائے نے ان اشعار کی ذاتی اور شخصی کیفیت کو اُبھرنے نہیں دیا۔ اس نظم میں محبت کے تجربے کی بازگشت اپنے تمام تر رنگوں کے ساتھ آشکار ہوئی، تو شاعر کے اس تجربے کی بوباس صداقتِ احساس کے جذبے سے معمور ہو گئی۔

اس نظم کے آغاز میں انھوں نے اپنی زندگی کی چار عزیز ترین چیزوں کا تذکرہ کیا: کتاب، چراغ خواب اور تم۔ 'تم' کی اس تلازماتی اپیل کو افتخار عارف نے واحد حاضر کے صیغے میں برتا ہے۔ یہ نظم ایک مکالماتی آہنگ رکھتی ہے۔ مکالمے کا پھیلاؤ شاعر اور 'تم' سے ہوتا ہوا، خود کلامی کے منظرنامے کو محیط ہے۔ 'تم' سے شاعر کا تخاطب قدرے مدہم اور مبہم ہے، مگر ہے ضرور، البتہ 'تم' کو اپنی ذات کی اکائی مان کر اپنے وجود کی کلیت سے مکالمہ خود کلامی کے منظروں کا امین ہے۔

کتاب، خواب اور چراغ کی مثلث افتخار عارف کے تہذیبی اور فکری منظرنامے کا جمالیاتی اور معنوی اظہاریہ ہے۔ ان تہذیبی اشیا کی موجودگی میں 'تم' کا ہونا: زندگی کے فکری، روحانی اور مادی رویوں کو مکمل کرتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک شے کی کمی سے زندگی کی کلیت کا تصور اُبھر نہیں سکتا، کیوں کہ چراغ کی روشنی اور کتاب و خواب کے مابین موجود منزلوں تک رسائی 'تم' کے وجودی احساس کے بغیر ممکن نہیں...... شاید ہو سکتی بھی نہیں، کیوں کہ 'تم' کا معنوی پھیلاؤ کتاب و

خواب کے فکری احساس کی اکائی کا تعین کرتا ہے اور اس تعین کے بغیر اعتبارِ وجود کی روایت قائم نہیں رہ سکتی۔ یہی اثاثۂ زندگی زادِ سفر بن کر دُعا کی تاثیر میں نمایاں ہوتا ہے، تو پھر زندگی مسکرانے لگتی ہے اور اگر اس زادِ سفر میں 'تم' کا وجود معدوم ہو جائے، تو پھر زندگی کا یہ سفر محض کاروبارِ حیات بن کر مادی زندگی کا نقیب بن جاتا ہے اور زندگی کے تمام تر رنگوں کا اشاریہ نہیں ہو سکتا، کیوں کہ شاعر کو دل کے جادۂ خوش خبر پہ اس (تم) کے سوا کسی کا گزر بھی گوارا نہیں۔

(۲) اور هوا چپ رهی

'اور ہوا چپ رہی' افتخار عارف کی اہم ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم عصری منظرنامے میں سیاسی جبریت کا اظہاریہ ہے۔ شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے بسیروں کا اُجڑنا آدمی کی بے بسی اور نامساعد سیاسی حالات کے جبر کا استعارہ ہے۔ نظم کے بنیادی فکری رویے: تاریخی اور تہذیبی علامات سے مزین ہیں۔ سیاسی جبر کے موسم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خوف زدگی کا منظرنامہ ایک ایسے فکری رویے کو جنم دیتا ہے، جو خوف اور تنہائی کا اشاریہ ہے۔ گُل زمیں اور اس کے موسم: زرد پرچم اڑاتے لشکرِ بے اماں کے ہاتھوں پامال ہوتی زندگی کے اکلاپے، دکھ اور خوف کی کیفیات کے عکاس ہیں۔ جب آرزومند آنکھیں، بشارت طلب دل اور دعاؤں کو اٹھے ہاتھ بے ثمر رہ جائیں اور ہوا چپ رہے، تو پھر...... ناامیدی کی فضا انسانی زندگی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور روشنی کی کوئی نوید زندگی کے در و بام کو اُجالنے کا فریضہ انجام نہیں دے پاتی۔ ایسے موسم کی حبس زدگی...... زندگی کی بے معنویت کا استعاراتی رنگ اُجاگر کرتی ہے اور یوں خارجی حالات اور واقعات کا دباؤ زندگی کے داخلی رویوں کو بھی بے پناہ متاثر کرتا ہے، جس سے شاعر زندگی کے رجائی پہلوؤں کے آہنگ بھی مرتب نہیں کر پاتا، بلکہ وہ بے رحم موسموں کی بے آب و رنگ کیفیتوں میں دکھ اور خوف کی ایک نئی جبریت کا احساس نمایاں کر دیتا ہے۔ نظم جب اپنے اختتامی آہنگ کی طرف بڑھتی ہے، تو شاعر یاس انگیز احساس کا نقیب بن جاتا ہے:

☆

اور تب حبس کے قہرماں موسموں کے عذاب ان زمینوں پہ بھیجے گئے

اور منادی کرادی گئی

جب کبھی رنگ کی، خوشبوؤں کی، اڑانوں کی، آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے گی

یہ عذاب ان زمینوں پہ آتے رہیں گے

[۷]

افتخار عارف کی اکثر نظموں کا معنوی آہنگ فرد کی تنہائی اور بے بسی کی استعاراتی اپیل سے چہرہ نمائی کرتا ہے۔ فرد کی یہ تنہائی اپنے اندر انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ اجتماعی طرزِ احساس کے قرینے بھی رکھتی ہے۔ فرد سے اجتماعی زندگی تک کا سفر ان کی تنہائی کا یہ استعاراتی اظہار، شخصی سطح پر، تخلیق کار کی روحانی زندگی کی بوقلمونی اور اجتماعی حوالے سے انسان کی تہذیبی جمالیات کا امین ہے۔ ان کے ہاں تنہائی کی معنوی تعبیر کسی منفی طرزِ اظہار کی ترجمانی نہیں کرتی، بلکہ یہ تہذیبی روایت میں فرد کی خاکساری اور عاجزی کی گواہ بن جاتی ہے۔ تنہائی اور بے بسی کے سوتے خوف کی سرزمین سے پھوٹتے اور عجز و عاجزی کی آب و ہوا میں برگ و بار لاتے ہیں۔ یہ فکری رویے ایک طرف مادی زندگی کی تلخیوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، تو دوسری طرف دُعا کے تناظر میں ان کا معنوی پھیلاؤ روحانی تجربوں کا غماز بن جاتا ہے۔ یہ رویے شاعر کی فکری بصیرت کے گواہ ہیں، کیوں کہ شعری اور تخلیقی پیش منظر میں ان کی فکری ترجمانی شاعر کے اثباتی طرزِ فکر کے رنگارنگ تجربوں کی نقیب بن جاتی ہے، جس سے ان کا زندگی اور اس کے متنوع رویوں پر اعتماد بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بہ قول:

> ”افتخار عارف کی شاعری میں زندگی اور اس کے روشن مستقبل کے بارے میں اعتماد و ایقان کی ایک ایسی فضا بھی ملتی ہے، جو زندگی سے دست و گریباں رہ کر اسے تابناک بنانے کی جرأت و آرزو بھی رکھتی ہے۔“ (۸۲)

(۸)

لفظوں کا دروبست جہاں ایک طرف نظم میں معنی آفرینی کا پیش خیمہ ہے، وہاں دوسری جانب

فنی حوالے سے ردھم اور آہنگ کی معنویت کو اُجاگر کرتا ہے۔ افتخار عارف کے ہاں لفظوں کا چناؤ اور ان کا فنی اور جمالیاتی استعمال، ان کی شاعری کو ایک ایسا زیروبم عطا کرتا ہے، جس سے موسیقیت کا تأثر: حسنِ سماعت کو خوش گوار رویوں سے آشنا کر دیتا ہے۔ ان کی نظمیں لفظی دروبست اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے داخلی آہنگ کی جمالیات کی آئینہ دار ہیں۔ وہ تخلیقی سطح پر لفظ کو برتنے کے ہنر سے آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ لفظ کی تہذیب اپنے اندر جہانِ معنی کے اتنے رنگ رکھتی ہے کہ جن کا طلسماتی اظہار انھیں تخلیقی فن کدے کی کو ملتا سے مملو کر کے زندگی آمیز رویوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ لفظ کا انتخاب شعوری اور لاشعوری طور پر ایک ایسی تہذیب سے وابستہ ہوتا ہے، جو صدیوں کے تخلیقی سفر کو طرزِ احساس اور طرزِ اظہار کی معنیاتی اپیل سے ہم آہنگ رکھتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے، تو شاید اتنا بے جا بھی نہ ہوگا کہ لفظ...... اپنی لفظی اور ظاہری سطح پر جمالیات کے تمام تر فکری اور معنوی رنگوں کا آئینہ دار نہیں ہوتا، ہوسکتا بھی نہیں، کیوں کہ جب لفظ کسی دوسرے لفظ کا مرادف نہیں ہوتا، تو پھر اس میں رنگوں اور خوشبوؤں کی رعنائی کیوں کر منعکس ہوسکتی ہے؟ البتہ اس کا خوب صورت اظہار اور استعمال اس کو ایک ایسا سرمدی لحن عطا کرتا ہے، جو اس کی زندگی کا بھی ضامن ہوتا ہے اور اس کے تخلیقی جوہر کا بھی...... لفظ کے باطن میں پوشیدہ جوہر کی بازیافت ہر تخلیق کار کے تخلیقی تجربے سے ہم آہنگ نہیں ہوتی اور جو شاعر...... لفظ کے باطن میں اُتر کر معنی کی تہذیب اور اس کے جمالیاتی دائرے تخلیق کرنے کی جرأت کرسکتا ہے، اس کے ہاں لفظی دروبست ایک ایسے تخلیقی اور وجدانی آہنگ کو جنم دیتا ہے، جو سُر تال کی جلوہ آرائی کا گواہ بن جاتا ہے۔ افتخار عارف کے ہاں لفظ اپنی تہذیبی اور معنوی روایت سے عکس انداز ہوتا ہے، تو اس کی معنوی اپیل صدیوں کا سفر کر کے مدینہ و نجف و کربلا کے زمانوں تک پھیل جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر صرف تاریخ کی معنویت کا نقیب نہیں ہوتا، بلکہ اس میں پوری تہذیبی معنویت اپنی تمام تر روایتی جمالیات کے ساتھ عکس آشنا ہو جاتی ہے...... وہ صدیوں کے واقعاتی آہنگ سے حسن معنی کی کشید کر کے اپنی روح کو حسنِ معانی کی تشکیل کے متعدد اور متنوع زاویوں سے مملو کرتا ہے، تو اس کے حسنِ آہنگ میں خوشبوئیں رقص کرتی ہیں اور رنگوں کی خوش

کلامی طلسماتی فضاؤں کی ترجمان بن جاتی ہے۔ رنگ اور خوشبو کی یہ استعاراتی اپیل لفظ کے باطن سے پھوٹتی ہوئی روشنی کی معنویت کا سراپا اوڑھ کر، زمان و مکاں سے ماورا، اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے، تو لفظ اپنے تخلیقی اعتبارات کی بدولت بقائے دوام کے دربار میں جاوداں اور ابدی سرمدیت سے مل جاتا ہے اور...... جس تخلیق کار کے ہاں یہ صورت پیدا ہو جائے، اس کی تخلیق غالب کے اس شعر کی تخلیقی رعنائی اور حسنِ خیال کی تعبیر سے آشنا ہو جاتی ہے:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لفظ کا تخلیقی اظہار اور جمالیاتی دروبست افتخار عارف کی شاعری میں ایک ایسی غنائی کیفیت کو منکشف کرتا ہے، جو گنجینۂ معنی کا طلسم کدہ بھی بناتی ہے اور فنی اعتبار سے صوت و سرود کی خوش آہنگی کا دریچہ بھی وا کرتی ہے، ان کے ہاں لفظ کا پردہ اور حجاب: نوا ہائے ساز کی جمالیات کا امین بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر توصیف تبسم کے خیال میں:

> ''افتخار عارف کا شعر ہمارے حواس بالخصوص حسِ سماعت کے ذریعے ہم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم مفہوم کی گرہیں کھولیں اور حجابِ لفظ اٹھا کر معنی تک پہنچیں، وہ ہمیں پوری طرح اپنی گرفت میں لے چکا ہوتا ہے۔ وہ مقام ہے، جہاں شاعری اور ساحری کی حدِ فاصل معدوم ہونے لگتی ہے۔ شعر کی ایک قسم وہ ہے، جس کی انگلی پکڑ کر قاری اس کو اپنے ساتھ ملانے کی سعی کرتا ہے اور ایک شعر وہ ہوتا ہے، جو پڑھنے والے کا رفیقِ سفر بن جاتا ہے۔

افتخار عارف کی نظمیں اور غزلیں پڑھتے ہوئے بار بار ایسا لگتا ہے، جیسے وہ خود ہم پر وارد ہو رہا ہو۔ افتخار عارف کے یہاں اور نظموں میں مصرعوں اور ٹکڑوں کا اعادہ، آوازوں کا اتار چڑھاؤ اور لفظوں کا دروبست اس کیفیت کا آئینہ دار ہے، جو شاعر کے مزاج کا حصہ ہے، جسے غنائیت کا نام دیا

جاتا ہے۔“(۸۳)

افتخار عارف کا شعری اسلوب ان کی فنی شناخت اور تہذیب کا ترجمان ہے۔ ان کے تخیل کی خلاقی اور جمالیاتی معنی آفرینی نے اسلوب کی ساخت پرداخت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کا فن زندگی کے خوش گوار اور حیرت زا عناصر سے متشکل ہوا ہے۔ وہ لفظوں کے انتخاب سے لے کر مصرع سازی یا سطر بافی تک کے تمام معاملات میں شعوری طور پر اپنے زاویۂ نگاہ کو استعمال میں لاتے ہیں۔ ان کے مصرع: لفظ و تراکیب کے انفرادی آہنگ اور ان کی معنوی رعنائی کو اس طرح منکشف کرتے ہیں کہ مصرع میں غنائیت کا تاثر بڑھ جاتا ہے۔ لفظوں کا دروبست ان کے اسلوب کے بنیادی سُر تال کو مرتب کرتا ہے۔ مصرع کی داخلی موسیقی: شعر یا لائن کی دلکشی کا سماں باندھ دیتی ہے۔ نظموں میں لائن یا سطر کا داخلی نظام پوری نظم کے منظرنامے میں پھیل کر ایک ایسی اکائی کو جنم دیتا ہے، جو معنوی اور فکری اعتبار سے تو ابلاغ اور ترسیل کا ترجمان ہے ہی، فنی حوالے سے ایک تسلسل اور ارتباط کا آئینہ دار بھی ہے۔ ان کے مصرع یا لائن کا ردھم، ان کی نظم کے مجموعی منظرنامے میں رنگ اور روشنی کا ایک ایسا مربوط نظام تشکیل دیتا ہے، جو سُر لہر کی کوملتا سے عبارت ہے۔ افتخار عارف کے ہاں سُر تال اور سُر لہر کی جمالیاتی اپیل ان کے فنی آہنگ کو ایک نئے رنگ سے ہم آہنگ رکھتی ہے۔ وہ مصرع کے باطن میں اپنے شعوری تاثر کی ایک ایسی لہر فروزاں کر دیتے ہیں، جس سے ان کا شعری آہنگ ان کے فکری اسلوب کا عکاس بن جاتا ہے۔

(۹)

افتخار عارف کے اسلوب کی معنیاتی اپیل ان کے داخلی اور وجدانی آہنگ کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے داخلی نظامِ غنائیت سے شعر بافی کے عمل کو اس طرح مزین کرتے ہیں کہ جذبے کی سچائی فن کی رعنائی سے مل کر نئے رنگ و آہنگ کی ترجمان بن جاتی ہے۔ پروفیسر نظیر صدیقی کے بہ قول:

> ”افتخار عارف کے یہاں شاعری صرف لفظوں کا کھیل نہیں ہے۔ ان کی شاعری کو Readable بنانے میں ان کے خیال، ان کے تجربے اور ان کے زاویۂ نگاہ یا طرزِ احساس کو بھی بڑا دخل ہے۔ ان کا تخیل: بڑا خلاق اور معنی

آفریں واقع ہوا ہے۔ وہ پرانے واقعات سے نئے مضامین اور نئے موضوعات سے اجتماعی تجربات اخذ کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کا وہ خوب صورت امتزاج ملتا ہے، جو فن اور زندگی دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے۔...... ٹی ایس ایلیٹ نے اچھی شاعری کی پہلی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ Readabilty ہو، یعنی اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھ جاسکے۔ اگرچہ میرے نزدیک Readability ایک خارجی معیار سے زیادہ ایک داخلی اور انفرادی معاملہ ہے۔ ایک ہی چیز ایک ہی شخص کو نہایت دل چسپ معلوم ہوتی ہے، دوسرے کو صبر آزما۔ پھر بھی اچھی شاعری کا پہلا اندازہ اسی طرح کیا جاتا ہے کہ وہ پڑھنے میں اچھی لگتی ہے یا نہیں۔ اس کی زبان کیسی ہے؟ اس کا اندازِ بیان کیسا ہے؟ الفاظ کی نشست، ترکیبوں کی خوش آہنگی، پورے مصرع کی موسیقی اور مجموعی طور پر پورے شعر کی دل کشی اگر پہلی نظر میں قاری کو اپنی گرفت میں نہیں لے لیتی، تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ شاعری Readability تو نہیں ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ اسے بعض دوسری خوبیوں کی بنا پر پڑھنا ہی پڑے۔" (۸۴)

افتخار عارف کی شاعری Readability بھی ہے اور دوسری خوبیوں سے بھی محروم نہیں۔ Readablity شاعری کی ایک ایسی خوبی ہے کہ جس کا تعلق معنوی فضا اور فکری ماحول کے ساتھ تو ہے ہی، اس کا ایک اہم اور بنیادی تعلق خارجی آہنگ سے بھی وابستہ ہوتا ہے۔ صوتی آہنگ اور موسیقیت کی ترجمانی: شاعری کے اس رویے کو سمعی اور بصری کے حواس کی تاثر پذیری کا آئینہ دار بنا دیتی ہے۔ فوری طور پر شعر یا نظم کا ردھم اور صوتی تاثر قاری کی توجہ کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ لفظوں کی نشست و برخاست اور ان کا صوتی حسن: جہاں سُر تال اور اس کی داخلی لے کاری کو انگیخت کرتا ہے، وہیں یہ شاعری کے عمومی آہنگ کی بصیرت افروزی کے کیف اور کم کو بھی نمایاں کر دیتا ہے، جس سے شعر خوانی کا عمل شاعر کے بنیادی اسلوب کی شناخت کا ترجمان بن

جاتا ہے۔ یہ ترجمانی خارجی تأثر سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اس کے داخلی شعور کی دلیل بن جاتی ہے اور یوں شاعر کا پورا اسلوبیاتی آہنگ اپنی تمام تر جمالیات کے ساتھ منکشف ہوتا ہے۔ یہ انکشاف ایک طرف خارجی اور صوتی تأثر کا عکاس ہوتا ہے، تو دوسری طرف اس کا دائرہ اثر مختلف اور متنوع خوبیوں کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ نظیر صدیقی نے متذکرہ بالا اقتباس میں جن خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ افتخار عارف کے ہاں مصرع سازی کے عمل اور اس کے بین السطور موجود داخلی کیفیات سے مزین ہیں:

> ''سچی اور اچھی شاعری کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف سنتے وقت اچھی لگے، بلکہ پڑھنے میں بھی اچھی لگے۔ افتخار عارف کی شاعری اس معیار پر بھی پوری اُترتی ہے۔ اگر یہ تأثر غلط نہیں، تو ان کی شاعری میں سماعت اور بصارت دونوں کی تسکین و تلذذ کا سامان موجود ہے۔ جہاں ان کے اشعار کانوں میں رس گھولتے ہیں، وہاں ان کے الفاظ: خصوصاً ان کی تراکیب آنکھوں کو جگمگاہٹوں کی ایک خوش گوار کیفیت سے آشنا کرتی ہیں۔'' (۸۵)

(۱۰)

تمثال کاری یا پیکر تراشی کا عمل اردو کے اکثر و بیشتر شاعروں کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی غزلوں اور نظموں میں جو پیکر تراشے ہیں، وہ حرکی تصورِ حیات سے ماخوذ ہیں۔ ان میں زندگی کی تعبیر اور تفسیر کے رنگ اپنی تمام تر جمالیات کے ساتھ نمایاں ہیں۔ علّامہ اقبال کے بعد، اردو شاعری میں کتنے ہی شاعروں نے اس فنی وسیلے سے استفادہ کیا ہے اور تمثال کاری کے نادر نمونے تخلیق کیے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی اور اس کے تمام تر معاملات کی عکاسی کے متنوع رنگ دکھائی دیتے ہیں، مگر ان شاعروں میں افتخار عارف کے ہاں پیکر تراشی اور تمثال کاری کا عمل منفرد رویوں کا حامل رہا ہے، ان کے اس فنی وصف پر اگر کچھ اثرات دکھائی دیتے ہیں، تو وہ محض موضوعاتی اشتراک کے باعث اقبال کے ہیں، کیوں کہ علامہ اقبال نے کربلا اور اس کے مقدس کرداروں کے حسنِ عمل سے زندگی کے رنگ کشید کر کے انھیں استعاراتی اور تمثیلی آہنگ میں برتنے کا جتن کیا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ طرزِ احساس ایک نئے انداز سے افتخار

عارف کی نظم و غزل میں بھی در آیا ہے۔ انھوں نے دشتِ کربلا اور اس واقعے سے وابستہ شخصیات کے حسنِ فکر و خیال کی تعبیر کو ایک نئے آہنگ میں منعکس کیا ہے۔ یہ واقعہ ان کے ہاں واقعاتی قطعیت کے بجائے استعاراتی اور تمثیلی جمالیات کی اوٹ سے آشکار ہوا ہے اور انھوں نے جو images تخلیق کیے ہیں، وہ ان کی بصیرت افروزی کے متنوع رنگوں کو عکس انداز کرتے ہیں۔ افتخار عارف کے ہاں سیاہ اور آتشیں رنگ کی بہت اہمیت ہے۔ ان رنگوں کی تاریخی اور تہذیبی تناظر میں معنویت کی تشکیل پیکر تراشی اور امیجری کے عمل کو فروزاں کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ:

> ''معنوی سطح پر شعر کا جن امیجری میں بند ہوتا ہے۔ جدید شاعر نے جتنی قوت سیاسی نظریوں، کھوکھلے نعروں اور سطحی خیالات سے حاصل کی ہے، اگر اس کا عشرِ عشیر بھی وہ امیجری سے حاصل کرتا، تو روایت کی توانائی اس کی شاعری پر نئے آفاق کھولنے میں ہرگز بخل نہ کرتی۔ افتخار کی امیجری میں جدت کی روشنی اور روایت کی گہرائی کے ساتھ شعور کی توانائی اور مشاہدے کی گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ جہاں وہ ترکیب سازی میں غالب سے استفادہ کرتے ہیں، وہیں امیجری کی تشکیل و تصویر میں میر سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔'' (۸۶)

افتخار عارف نے پیکر تراشی کے عمل میں اپنے تفکر کی رعنائی اور مشاہداتی تکشف کی جلوہ آرائی کے امتزاج سے بنیادی نوعیت کا کام لیا ہے۔ ان کی نظموں میں تمثال کاری کے خوش رنگ اور خوش آہنگ نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کبھی محض لفظ کے انتخاب سے اور کبھی پوری ترکیب کے استعمال سے image بناتے ہیں، جس سے ان کے گہرے تخلیقی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چند مثالیں دیکھیے:

تھکے ہوئے آسمان کے مضمحل ستارے

میں جانتا تھا مرے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جائیں گی اور تماشائی
رقصِ شعلہ فشاں پر اصرار ہی کریں گے

☆

خُدا کرے بشارتیں سنانے والے خوش کلام طائروں کی ٹولیاں
اُفق سے شاخِ گل تلک علامتِ وصال کی لکیریں کھینچ دیں

☆

ہوائیں فاحشہ ہیں
سر پھری پاگل ہوائیں فاحشہ ہیں
آرزوئے وصل میں قریہ بہ قریہ گھومتی ہیں
برگ وگُل سے کھیلتی ہیں، نسبتِ وارفتگی کی سرخوشی میں جھومتی ہیں
اور فضائیں زرد پڑ جائیں، تو پھر یہ بھی بگولوں کے لباسِ گرد میں
سارے خس وخاشاکِ شہرِ بے نمو کو چومتی ہیں

☆

سنا ہے ایسے لوگ ہیں کہ جن کی زندگی کے دن
کھلے ہوئے گلاب ہیں
سجے ہوئے چراغ ہیں
گلاب: جن کی نکہتوں کے قافلے رواں دواں
چراغ: چار سو بکھیرتے ہوئے تجلیاں

☆

افتخار عارف کے موضوعاتی کینوس کے مطالعاتی آہنگ سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جہاں وہ اپنے موضوعات کی تشکیل اور انتخاب میں دینی روایت اور تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے متنوّع رنگوں سے اخذ و استفادہ کرتے ہیں، وہیں ان کا فنی آہنگ بھی قدیم اور جدید رنگوں کے امتزاج سے جنم لیتا ہے۔ وہ نہ تو نرے 'جدیدیئے' ہیں کہ جن کی زبان اور اسلوب اپنی تہذیبی روایت سے جڑا ہوا نہ ہو اور نہ ہی وہ محض کلاسیکی رنگ و آہنگ کے ترجمان ہیں کہ جسے عصری حسیت اور زبان و بیان کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا شعور نہ ہو، بلکہ وہ ایک ایسے تخلیق کار ہیں کہ جن کے ہاں زبان کا اپنی تہذیب کے ساتھ گہرا تعلق بھی موجود ہے اور یہ اس کے بدلتے آہنگ اور اس کے تیوروں سے بھی بے خبر نہیں۔ ان کے ہاں زبان، لب و لہجے اور طرزِ اظہار کی رعنائی چونکہ اپنے تہذیبی آہنگ کے جمالیاتی اسلوب سے پھوٹتی ہے، اس لیے جمالیاتی طرزِ احساس کے فکری اور معنوی پیرائے کہیں ترکیب سازی کی اوٹ میں جہانِ معنی کی خبر دیتے ہیں اور کہیں متحرک تمثالوں کے رنگوں کی دنیا آشکار کرتے ہوئے نئی معنوی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے الفاظ میں:

> ''افتخار عارف کی شاعری کا روایت سے رشتہ پرانا ہی نہیں، مضبوط بھی ہے، لیکن ان کا ہر قدم جدیدیت کی طرف اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ فیض صاحب نے ان کے ہاں میر و غالب سے لے کر فراق اور راشد سبھی کی جھلکیاں دیکھی ہیں، لیکن بر بنائے انکسار اپنا نام نہیں لیا۔ حالاں کہ افتخار عارف نے سب سے زیادہ اثرات فیض صاحب کے ہی قبول کیے ہیں۔ عرض کرنے کا مطلب یہ کہ انھوں نے روایت سے ہم رشتہ ہو کر جدیدیت کی طرف پیش قدمی کی اور اپنا رنگِ سخن نیا ایجاد کیا۔ ان کی شاعری کا ایک روپ دیومالائی بھی ہے اور یہ اس نئی زبان میں سامنے آتا ہے، جس کی تخلیق میں افتخار عارف نے اپنا خونِ جگر جلایا ہے اور اظہار کی طناب ابلاغ کے ساتھ ملا دی ہے اور اس غم کو ابھارا ہے، جو غمِ ذات سے بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افتخار

عارف: ناصر کاظمی کے بعد کی نسل کے ان چند شاعروں میں سے ہیں، جن کو علمی اور ادبی حلقوں میں سب سے زیادہ موضوعِ بحث بنایا گیا، لیکن افتخار عارف نے تو حیرتوں اور معصومیتوں کو بھی جگایا تھا۔ چنانچہ بڑے بڑے شعرا اور ادبا نے ان میں شرکت کی، تو وہ سب حیران رہ گئے اور پھر جدید شاعری میں ان کے اسی مقام کو بلاتوقف تسلیم کر لیا، جو افتخار عارف نے بارھویں کھلاڑی کے منصب کو تج کیے بغیر اپنے افتخارِ فن سے حاصل کیا۔'' (۸۷)

(۱۲)

افتخار عارف نے تراکیب سازی اور ان کے انتخاب اور استعمال میں اپنی ندرتِ فکر اور جدتِ ادا سے کام لیا ہے۔ یہ تراکیب، اپنے موضوعاتی اور فکری کینوس کی جمالیاتی تہذیب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں، کیوں کہ یہ ایک طرف تمثال کاری کے آہنگ کو معنوی ترسیل کے فنی پیرائے سے وابستہ رکھتی ہیں، تو دوسری طرف صوتی تاثر کی غنائی کیفیت کو اُجالنے میں معاون ہیں۔ افتخار عارف نے مصرع بافی کے عمل میں تراکیب کی منفرد اور اسلوبیاتی اور معنیاتی رنگارنگی سے خارجی اور داخلی سطح پر وجدانی شعور کی تہذیب میں بہت استفادہ کیا ہے۔ وہ اس سے بہ خوبی آگاہ ہیں کہ تراکیب کا کومل اور سجل اسلوب: مصرع کے بنیادی آہنگ کو مرتب کرنے اور معنوی ترسیل کے ابلاغ میں اساسی کردار کا حامل ہے، کیوں کہ تراکیب کا بوجھل پن مصرعوں کے حسن کو تاراخت کرنے میں بھی دیر نہیں کرتا۔ اگر تخلیق کار تراکیب کے سبک اور Sublime انداز کا شعور رکھتا ہو، تو وہ اس عیبِ شعری سے بچ نکلنے میں کامگار ہو جاتا ہے، بہ صورتِ دیگر مصرعوں اور لائنوں کی کو ملتا تراکیب کا بوجھ اٹھانے سے قاصر رہتی ہیں اور یوں شاعری اکھڑے اور لڑکھڑاتے لب و لہجے کی داستان بن کر طاقِ نسیاں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگر تراکیب کومل اور سجل طرزِ اظہار کی علامتی معنویت سے مملو ہوں، تو پھر مصرع یا لائن کی دلکشی اور خوب صورتی: نشاط آمیز آہنگ سے بھر جاتی ہے۔ معنوی ترسیل اور ابلاغ سے قبل کے مدارج شعر: اس کے خارجی حسن میں اضافے کا سبب بنتے ہیں اور اس طرح مصرع یا لائن کا جمالیاتی اور صوتی منظر نامہ تاثیر سے بھر جاتا ہے۔

افتخار عارف کے ہاں تراکیب کا صوتی حسن اور جمالیاتی آہنگ ان کی شاعری کے مجموعی فکری اور فنی مزاج سے جڑا ہوا ہے۔ وہ اس سے متنوع رنگوں کی تہذیب کا کام لیتے ہیں۔ تراکیب کا یہ علامتی اور تمثیلی حسن، ان کے حسنِ خیال اور خیالِ حسن کی معنوی تعبیر کا اشاریہ ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی رقم طراز ہیں کہ:

"اکثر کوتاہ اندیشوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اضافت سے اسلوب بوجھل ہو جاتا ہے، حالانکہ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ کہیں تو ایجاز اور ترنم کلام کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ دو لفظوں کے درمیان اضافت سے رابطہ پیدا کیا جائے۔ اسی طرح فارسی مزاج کی ترکیبوں کا استعمال اردو بولنے والوں نے تقریباً ترک کر رکھا ہے۔ میر، سودا، غالب اور اقبال کے اسلوب کی شوکت اور جزالت میں موزوں تراکیب کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ایک ترکیب اگر صحیح مزاج کے ساتھ بن جائے، تو اتنے مفہوم کا احاطہ کر لیتی ہے، جو چند سطروں میں بھی اچھی طرح ادا نہیں ہو سکتا، لیکن ترکیب سازی کے لیے بڑا رچا ہوا ذوق اور منجھا ہوا علم درکار ہے۔ افتخار عارف کا علمی اور تہذیبی پس منظر انھیں اچھی اور خوش وضع ترکیبیں ڈھالنے میں مدد دیتا ہے۔...... افتخار عارف کے اسلوب نے نظم کی قوت اور اظہار و ادا کی شوکت، بالیدگی اور حرارت غالب سے حاصل کی ہے، جو خود چمنستانِ بیدل کے خوشہ چین تھے۔" (۸۸)

کسی بھی تخلیق کار کے ہاں ترکیب سازی کا ہنر اگر تکلف اور تصنع کے عمل سے نکلنے میں کامگار ہو جائے اور اس پر علم کے بجائے وجدانی طرزِ احساس کا سایہ موجود ہو، تو پھر تراکیب سازی کی یہ روایت اپنی تہذیبی زندگی کے آثار سے معطر رہتی ہے اور یوں تخلیق کار علم کے بجائے وجدان پر اپنے فنی شعور کی بنیاد رکھتا ہے، جس سے اس کے ہنر پر جمالیاتی تہذیب کی گرفت مضبوط رہتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو لفظی در و بست: گنجینۂ معنی کا طلسم کدہ بن جاتا ہے، تو دوسری طرف

تراکیب کی صوتی تاثر پذیری نئے رنگ و آہنگ کی نقیب ٹھہرتی ہے۔اس سے مصرع یالائن کی مجموعی معنوی فضا رنگا رنگی سے معمور ہو جاتی ہے۔اس مقامِ ہنر تک رسائی آسان نہیں اور نہ ہی یہ ہر تخلیق کار کا مقدر ہوتی ہے یا اسے ہونا چاہیے، بہ قولِ علامہ اقبال: انھی کا کام ہے یہ، جن کے حوصلے ہیں زیاد...... کیوں کہ ڈھیروں تنِ شاعر کا لہو خشک ہوتا ہے، پھر ایک مصرعِ تر کی تخلیق ممکن ہوسکتی ہے۔

افتخار عارف ان تخلیق کاروں میں نمایاں ہیں، جن کے ہاں لفظ اپنے تخلیقی آہنگ سے معطر رہتا ہے اور یہ لفظ...... لفظی سطح پر بھی اور ترکیب کے عمل میں آمیخت ہو کر بھی اپنے صوتی آہنگ اور معنوی شعور کی ترسیل اور ابلاغ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔لفظ و تراکیب کی یہ صداقت ان کے کلام کے مجموعی فنی اور فکری منظرنامے کو اُجالنے اور نئے رنگوں کو تخلیق کرنے سے عبارت ہے۔انھوں نے ترکیب سازی کے عمل میں اپنے وجدانی مکاشفے سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور یوں تہذیبی روایت سے روشنی کشید کرنے اور خوشبو کے چراغ جلانے کے ہنر سے بہرہ ور رہے ہیں۔ترکیب سازی کی طرح علامت اور استعارے کا رنگ اور ان کی روشنی بھی ان کے کلام کے فنی اور فکری ابعاد کو ضوفشاں کرنے میں نمایاں رہی ہے۔ان کی علامتیں اور استعارے دینی روایت اور تہذیبی و ثقافتی پس منظر سے برگ و بار لائے ہیں۔ان کی معنوی اپیل اپنے اندر جمالیاتی شعور کی شمع جلائے ہوئے ہے، کیوں کہ:

> ”وہ روایت کے حرم میں رہتے ہوئے ایک نیا جہانِ معنی پیش کرتے ہیں، جو اجنبی ہوتے ہوئے بھی مانوس ہے اور نامانوس کو مانوس بنا کر پیش کرنا ہی فنکار کا کمال ہوتا ہے۔ان کے رموز و علائم اور استعاروں کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ان کے ذہنی آفاق کی پیمائش کی جاسکتی ہے۔یہ علامتیں بے جان اور اکہری نہیں ہیں۔ان کی معنوی حیات میں کچھ اور وسعتیں بھی شامل ہوگئی ہیں، مثلاً: انھوں نے واقعاتِ کربلا کی علامتوں کو تمام دوسرے روایتی شاعروں سے بچ کر نئی معنویت کے ساتھ استعمال کیا ہے اور ان کی

مدد سے آفاقی اقدار کی وکالت کا کام لیا ہے۔ ان میں سے بعض علامتوں کو انھوں نے کلاسیکی شعرا کے ابہام کی سرحدوں تک پہنچا دیا ہے، مگر لفظی بازی گری کے الزام سے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ یہ کوئی معمولی کمال نہیں ہے۔'' (۸۹)

علامتی اور استعاراتی تہذیب کے رنگ: افتخار عارف کی شاعری میں اجتہادی طرزِ احساس کے آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے ان علائم کو اپنی شاعری کے در و بام اُجالنے کے لیے اس طرح برتا ہے کہ ان سے آورد کا گماں نہیں گزرتا، بلکہ ان کی تخلیقی اپج اور وجدانی کیف و کم نے انھیں آمد کی تعبیر اور تفسیر کا عکاس بنا دیا ہے۔ ان کی علامتیں اپنے تہذیبی پس منظر کے ساتھ ایک ایسی دنیا تشکیل دیتی ہیں کہ جن کے فکری زاویے اپنی رعنائیٔ احساس کی جمالیات سے مملو ہوتے ہیں۔ ان کا تہذیبی منظر نامہ اپنی معنوی اور فکری جمالیات کے ساتھ ان کے کلام میں آن موجود ہوتا ہے اور یوں ان کی فکری تعبیر ایک ایسے پیش منظر کو مرتب کرتی ہے، جو ایک طرف روایت کی روشنی سے معمور ہوتا ہے، تو دوسری طرف اس میں لحۂ موجود کی خوشبو رقص کناں رہتی ہے۔

افتخار عارف کے ہاں کوئی بھی علامت اکہری اور لفظی سطح پر وارد نہیں ہوتی، کیوں کہ علامت کا لفظی سطح پر استعمال اسے تہذیب اور روایت کے دھارے سے کاٹ کر فضا میں معلق کر دیتا ہے، جس سے اس کی تہذیب کے تمام تر رنگ عکس انداز نہیں ہو پاتے۔ ان کے کلام میں علامت کی طرح استعارے کا منظر بھی دیدنی ہے۔ وہ اسے ہنروری سے استعمال میں لاتے ہیں، کیوں کہ استعارہ: اس انجانے اور ان دیکھے شہر کی خبر لاتا ہے، جس کا ساتواں در ہر تخلیق کار کے لیے وا نہیں ہوتا...... افتخار عارف کے کلام میں استعارے کی طلسماتی اپیل ان کے فنی شعور اور فکری وجدان کی گواہ ہے اور یہ گواہی...... زندگی کی گواہی ہے اور زندگی: بقا اور ابدیت کا استعارہ ہے، جس تخلیق کار کو زندگی کی ابدیت کی گواہی میسر آ جائے؛ اسے کسی دوسری گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

وہ نثر جس کا تصور متاعِ قریۂ دل

افتخار عارف کی نثر نگاری کا مطالعہ

[۱]

افتخار عارف باقاعدہ نثر نگار نہیں، یعنی انھوں نے اس فن کدے کو اپنے معنوی وفور اور فکری وجدان کا محور اور مرکز نہیں بنایا۔ وہ دنیائے نثر کے آسمان پر کبھی کبھار ہی طلوع ہوئے، مگر ان کے خیال کی رعنائی اور اسلوب کی زیبائی نے ان کے حسنِ تحریر کو ماند یا موہوم نہیں ہونے دیا۔ ان کی اکثر وبیش تر تحریریں ان کی منصبی ضرورت کے تحت منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں، لیکن اس کے باوجود یہ ان کی تخلیقی جمالیات کی ترجمانی سے محروم نہیں رہیں۔ ان کا یہ نثری سرمایہ مقدار میں یقیناً کم ہے، لیکن معیار اور قدر قیمت میں کم عیار نہیں۔ انھوں نے اردو میں بھی لکھا اور انگریزی میں بھی...... اور ہر دو زبانوں میں ان کا نثری اسلوب: ان کی فکری تازگی اور توانائی کا ترجمان ہے۔ وہ ضرورتاً اس وادی میں جلوہ آرا ہوئے، مگر اپنے تخلیقی تجربے اور جمالیاتی اپج کے باعث کامران اور کامگار رہے۔ انھوں نے اب تک نثر کی جن صورتوں میں سفر پیمائی کی، ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

۱۔ مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیاتِ پاکستان کی مطبوعات پر منصبی ضرورت سے لکھے گئے پیش لفظ

۲۔ مختلف شعرا اور ادبا کی کتابوں پر لکھے گئے فلیپ / آرا

۳۔ پاکستانی لٹریچر (مجلّہ اکادمی ادبیاتِ پاکستان) کے شماروں میں لکھے گئے انگریزی اداریے

۴۔ چند فکری اور ادبی موضوعات پر لکھے گئے اردو اور انگریزی مضامین

۵۔ بعض ادبی تقریبات کے لیے لکھے گئے خطبات

۶۔ شعر و ادب سے وابستہ دوستوں کو لکھے گئے مکاتیب

(۲)

افتخار عارف کی نثر نگاری کی یہ فکری، علمی اور ادبی جہتیں اپنے اندر زندہ رہنے کے تمام رنگ رس رکھتی ہیں، لیکن انھوں نے اپنی شاعرانہ افتادِ طبع کے باعث اس گنجینۂ معنی کی طلسماتی اپیل کو اپنے تخلیقی اظہار کا وہ سلیقہ اور قرینہ عطا نہیں کیا، جو معمولی توجہ کے سبب بقائے دوام کے دربار میں انھیں جاودانیت کے استعاراتی آہنگ سے ہمکنار کر سکتا تھا۔ متذکرہ بالا اداروں کی مطبوعات پر لکھے گئے ان کے پیش لفظ حسنِ خیال کی تاب ناکی اور رعنائی کا اشاریہ ہیں۔ شخصی، تکنیکی، علمی اور فنی موضوعات پر مبنی مختلف اور متنوع کتب پر ان کے پیش لفظ منصبی ضرورت کے باوجود ان کے حسنِ اسلوب کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے ان تحریروں میں اپنے تخلیقی وفور کی رعنائی اور حسنِ تحریر کی روانی کے وہ منظر تخلیق کیے ہیں، جس سے ان کی فکری جمالیات اور اسلوبیاتی آہنگ کی جلوہ گری کے کتنے ہی منظر آشکار ہوئے ہیں۔ ان کا مطالعاتی دائرہ صرف شعر و ادب کی کتابوں تک محدود نہیں، بل کہ ان کے مطالعاتی افادات: مذہب، تہذیب، تصوف، سماجیات، نفسیات اور فکریات کے موضوعات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ تازگی اور رعنائی: ان کی تحریر میں فکری معنویت کا بلیغ استعارہ بن کر عیاں ہوئی، جس سے ان کا نثری آہنگ: فکری تعبیر اور معنوی تفسیر کا لبادہ اوڑھ کر، تخلیقی تجربے کی سچائی کا نگار خانہ بن گیا۔ اس سے ایک طرف ان کے تنقیدی شعور کے رنگ نمایاں ہوئے، تو دوسری طرف اسلوبیاتی جہات کی ترجمانی کے وہ آہنگ وجود پذیر ہو گئے ، جو نثر کے معنوی اور فنی اوصاف کو فکری تہ داری سے مملو کر دیتے ہیں۔

(۳)

افتخار عارف کی نثر: تخلیقی رعنائی احساس کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور کی معنویت سے بھی معمور

ہے۔ وہ اپنے جملے کی ترتیب اور تہذیب کے بین السطور: کسی بھی حوالے سے نکتہ طرازی اور معنی آفرینی کے متنوع رنگوں کو عکس انداز کرتے ہیں، تو ان کی نثر ایک سطح پر تخلیقی شان سے مملو ہو جاتی ہے، تو دوسری جانب اس کا پیرایۂ اظہار تنقیدی رنگوں کی جمالیات سے مل جاتا ہے۔ یوں ان کی نثر میں ان کے تنقیدی شعور کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتی ہے:

''ادب و شعر اور تنقید و تحقیق کے چمنستانوں کی آبیاری میں مصروف فن کاروں سے گفتگو پر مشتمل یہ کتاب اردو کے عصری ادب کا ایک بھرپور، رنگارنگ اور دل کش منظر نامہ ہے۔ راشد حمید کلام، متکلم اور مکالمے کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ ہیں اور حرمت و تقدیس سے بھی آشنا۔ خود انھوں نے مکالمے کو 'کثرت میں وحدت کی تلاش' سے تعبیر کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک انٹرویو کا محرک ایک صحت مند اور توانا ادبی تجسس ہے۔ راشد حمید کا رویہ سرتاسر علمی و فکری ہے۔ وہ ذاتیات پر نہیں، نظریات پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور ایک ہی طرح کے سوالات کی جگالی کرنے کی بجائے ہر فن کار سے اس کے ادبی اور تہذیبی مزاج اور تہذیب و فن میں اس کے منفرد کارناموں کے پیشِ نظر جُداگانہ سوالات پوچھتے ہیں۔ انٹرویو کی روداد قلم بند کرتے وقت بھی وہ علمی دیانت اور تعمیری نقطۂ نظر کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہیں۔''(۹۰)

افتخار عارف کے موضوعات میں تنوع اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے نثری اور شعری کتابوں پر فلیپ بھی لکھے ہیں اور مقتدرہ اور ادبیات کی مطبوعات پر پیش لفظ بھی۔ یہ کتابیں اپنے موضوعاتی کینوس میں ایک جہانِ معنی کا اظہاریہ ہیں۔ مختلف اور متنوع مزاج کی ان کتابوں پر لکھنا اور بھرپور رائے کا اظہار کرنا یقیناً وسعتِ مطالعہ اور اظہار کی تاب اور توانائی کا اشاریہ ہے۔ زبان و لسانیات، شعر و فلسفہ اور ادبیاتِ عالیہ کے تراجم (کتابوں) پر لکھے گئے ان کے ابتدائیے

اور اظہاریے ان کی مطالعاتی وسعت اور ان کے تہذیبی اور فکری شعور پر گواہ ہیں۔ ان کے طرزِ احساس اور طرزِ اظہار میں شاعرانہ لطافت اور ندرتِ خیال کے کتنے ہی جمالیاتی رنگ نمایاں ہیں۔ وہ لفظ کی حرمت اور اس کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ یہی آگاہی ان کے طرزِ اظہار کی پختگی اور جمالیاتی معنویت کی دلیل ہے۔

(۴)

مقتدرہ اور ادبیات کی مطبوعات پر لکھے گئے ان کے ابتدائیے ان کی فکری گہرائی کے غماز ہیں۔ اتنے مختصر ابتدائیوں میں انھوں نے کتابوں کے موضوعاتی تھیم (Theme) اور ان کے بین السطور موجود فکری وحدت کو اس طرح اپنی تحریر میں موضوعِ تعارف بنایا کہ کتاب کی معنویت کے متنوع رنگ ان کے پیش نامے میں منعکس ہو گئے۔ مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھنا...... اکہری معنویت اور اسلوب کے حامل نثر نگار کا کام نہیں، کیوں کہ موضوعات کی طلسماتی اپیل، جن متنوع رنگوں کی آمیزش کا تقاضا کرتی ہے، وہ ہر ایک ادیب اور مصور کے موقلم کا اشاریہ نہیں ہوتے، ہو سکتے بھی نہیں، کیوں کہ رنگوں کی جمالیات کو ان کی فطری شناخت سے مربوط کر کے، انھیں خیال کی نادرہ کاری سے ہم آہنگ مرتب کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح اگر ادیب کو لفظوں کے انتخاب اور ان کی جمالیات سے فطری مناسبت نہ ہو، تو پھر جملہ سازی سُر تال کی معنویت سے آشنا ہو کر، اسلوب کی رعنائی کا اشاریہ نہیں بن سکتی۔ اس سے شعر کی طرح نثری آہنگ بھی متاثر ہوتا ہے۔ رؤف امیر کے بہ قول:

> ''ان کا نثری اسلوب ندرتِ خیال اور احساسِ جمال سے عبارت ہے۔ اس میں جمالیات کے سارے سلیقے اور ترسیل کے تمام قرینے موجود ہیں۔''(۹۱)

مقتدرہ اور اکادمی کی مطبوعات پر لکھے جانے والے ابتدائیوں کی طرح، افتخار عارف نے منصبی فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں اکادمی کے انگریزی مجلّے پاکستانی لٹریچر پر اداریے بھی تحریر

کیے۔ یہ اداریے علمی اور ادبی مسائل کی ترجمانی میں اداریہ نویس کے فکری رویوں کے غماز بھی ہیں اور ان کی فکری اور موضوعاتی رنگارنگی کے عکاس بھی۔ اردو کی طرح ایک طرف یہ اداریے ان کی انگریزی دانی پر دال ہیں، تو دوسری طرف ان کے فکری اسلوب کا اشاریہ بھی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ ان اداریوں میں انھوں نے جو فکری منظرنامہ مرتب کیا ہے، وہ ان کے اسلوب کی جمالیاتی رعنائی کا بھرپور حوالہ بن جاتا ہے۔ ان کے اسلوبِ نگارش میں ان کے شخصی طرزِ احساس کی جھل مل دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں کوئی بھی فن پارہ...... تخلیق کی اکہری معنویت کا حامل نہیں ہوتا۔ اس میں معنی آفرینی اور فکری تہ داری کے کتنے ہی رنگ رس نمایاں ہوتے ہیں۔ یوں دفتری ضرورت سے لکھے گئے یہ اداریے بھی، ان کے اس اسلوب کے تخلیقی آہنگ کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کا حقیقی تعین ان کے اسلوبیاتی اور استعاراتی آہنگ سے مملو ہوکر، ان کی جمالیاتی تعبیر کو ہمہ رنگ اور ہمہ گیر رویوں سے مربوط کر دیتا ہے۔ موضوعاتی حوالے سے بھی یہ اداریے ان کی فکری گہرائی کے امین ہیں اور معنوی سطح پر بھی ان کی جمالیاتی اپیل خود اپنے ہونے کا جواز فراہم کرتی ہے، کیوں کہ اس سے ان کے تنقیدی شعور کا وجدانی رویہ: ابلاغ اور ترسیل کے احساس سے مل کر، جمالیات کے متنوع رنگوں کا آئینہ دار بن گیا ہے۔

(۵)

افتخار عارف نے عصری حسیت کے معنوی تناظر میں اپنے اسلوب کی رعنائی سے فکر و خیال کے وہ دیپ جلائے ہیں، جن کی روشنی ان کے جملوں میں لو دے رہی ہے۔ ان کا اسلوب ان کے شاعرانہ رنگ و آہنگ سے مملو ہے۔ وہ جملہ سازی کے تخلیقی حسن اور اس کی جمالیاتی رعنائی احساس سے باخبر ہیں۔ وہ جملے میں لفظوں کے در و بست کی فنی خصوصیات اور ان کے معنوی پیش منظر کو برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھیں لفظ کے معنوی آہنگ کی تہذیب کا بے پناہ شعور ارزانی ہوا ہے۔ شاعری کی طرح ان کی نثر بھی لفظ کی معنی آرائی اور رعنائیِ خیال کے احساس اور تموج سے مزین ہے۔ لفظ کی جمالیاتی اپیل جملے کے حسن اور معنویت کو کس طرح بڑھاوا دیتی ہے، افتخار عارف کی

نثری تحریریں ان کے فکری پھیلاؤ، تخلیقی آہنگ اور فنی شعور کا دیباچہ ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ایک مضمون کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

''میں ایک گناہگار اور گلے گلے دنیا میں دھنسا ہوا آدمی ہوں۔ ایک سطح پر جاننے اور سمجھنے کے باوجود، میرے نفس کی سرکشی بار بار مجھے توبہ کرنے کے باوجود ٹھوکر کھانے پر آمادہ کرتی رہتی ہے۔ سر زمین پر رکھتا ہوں، مگر دل قابو میں نہیں آتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا سیلِ فنا کی زد پر ہے، قدم پیچھے نہیں ہٹتے، مگر پھر بھی ایک یقین ہے، جو بار بار اپنے خالق و مالک کی طرف لے جاتا ہے کہ وہ ذاتِ بے نیاز مجھے اکیلا نہیں چھوڑے گی۔'' (۹۲)

اسی مضمون سے یہ اقتباس بھی پیشِ نظر رہے:

''تصوف صرف قال نہیں، حال کی ترجمانی کرتا ہے۔ انشا پردازیاں اپنی جگہ، لیکن اگر عمل نہ ہو، تو لفظ پتھر کی طرح لگتے ہیں۔ بات میں اثر: توفیق الٰہی سے آتا ہے اور عمل اس کی سب سے بڑی گواہی ہوتا ہے۔ جب سائلین سوال کر رہے ہوتے ہیں، تو شیخ اپنے مفید ارشاد سے گتھیوں کو سلجھا رہا ہوتا ہے۔ لفظ ایک فضا میں ادا ہو رہے ہوتے ہیں۔ زمان و مکان کی حدود و قیود میں ادا کیے گئے لفظوں کا کون سا سرا کن سرچشموں سے ہوتا ہوا کن منزلوں تک جاتا ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔ سماع کی محفلوں میں ایک سادہ سا مصرع کیسے دلوں میں قیامتیں برپا کر دیتا ہے، اس کو لفظوں میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟ خواجہ احمد جامؒ کے یہ دو مصرع ہم سب نے سن رکھے ہیں:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را

ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

کمال شعر ہے، مگر کون جانے کہ قطب الاقطاب شیخ العالم قطب الدین بختیار کاکیؒ نے کس حال میں ان لفظوں کو قبول کیا کہ روح قفسِ عنصری کو توڑ کر اعلائے علیین کی طرف پرواز کرگئی۔ ایک لفظ...... ایک جملہ...... ایک قصہ...... ایک کہانی کیسے دلوں کو منقلب کر دیتی ہے، وہی لوگ بہتر جانتے ہیں، جو کسی صاحبِ توجہ کے فیضانِ نظر سے فیض یاب ہو چکے ہوں۔" (۹۳)

لفظ کو نگینے کی طرح جملے میں برتنے کا ہنر ندرتِ احساس کو جنم دیتا ہے اور یہ احساس لفظ کے انتخاب اور استعمال کے تخلیقی زاویے میں اُتر کر اسے رنگ اور روشنی کی وہ جمالیاتی اپیل عطا کرتا ہے، جو اس کے فکری مواد کو نئی معنویت سے ہم آہنگ رکھتی ہے۔ لفظ کی یہ معنوی اور تخلیقی جہات: جملہ سازی کے عمل میں معاون اور مددگار رہوتی ہیں اور ان ہی سے جملے میں سُر تال کی وہ لہریں اُٹھتی ہیں، جو نثری تحریروں کی خارجی اور داخلی موسیقی اور غنائیت سے عبارت ہیں۔ لفظ کا ساز و آہنگ جملے کی ترتیب و تہذیب میں تخلیقی شان سے جلوہ آرا ہوتا ہے، تو اس سے صداقتِ احساس کے دریچے وا ہو جاتے ہیں اور یوں لفظوں کا باہمی ربط وضبط جملے کی موسیقیت کو دوچند کر دیتا ہے۔ جملے کی تہذیب میں لفظ کی معنیاتی جہات کا تخلیقی التزام: سُر تال کے ایک ایسے نظام کو منکشف کرتا ہے، جو جملے کی ساخت کو معنوی اکائی کا بیانیہ بنا دیتا ہے اور اس سے یہ معنیاتی اکائی جملے کی ساخت میں بنیادی اسلوب کا روپ دھار لیتی ہے۔ افتخار عارف کے مضمون سے منتخب کیے گئے متذکرہ بالا اقتباسات میں جملے کی ساخت کا جو اُسلوب نکھر کر سامنے آیا ہے، وہ ان کی لفظ شناسی، لفظوں کے تخلیقی دروبست سے آگاہی اور جملے میں لفظیات کے جمالیاتی اور تخلیقی آہنگ اور ارتباط کے منظر نامے سے گہری واقفیت کا غماز ہے۔ ان کے ہاں لفظ: تہذیبی معنویت کی اوٹ سے پیش منظر کے تناظر میں فکری سچائی کے تلازماتی آہنگ کا اظہاریہ بن جاتے ہیں، جس سے نثر کا آہنگ...... تخلیقی وجدان اور اس کے جمالیاتی شعور سے ہم آہنگ ٹھہرتا ہے اور 'دنیا سیلِ فنا کی زد پر ہے'...... جیسے جملے تخلیقی آہنگ میں ڈھل جاتے ہیں۔ 'ایک لفظ...... ایک جملہ...... ایک قصہ

.....ایک کہانی کیسے دلوں کو منقلب کر دیتی ہے؟ یہ جملہ ایک ایسی فکری اکائی کا اشاریہ ٹھہرتا ہے، جو فنی حوالے سے سُر تال اور زیر و بم کی جمالیات سے معمور ہوتا ہے۔ کسی بھی نثر نگار کے ہاں جملہ بنیادی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ خوب صورت لفظوں کے دریچوں سے منکشف ہوتا ہوا صوتی منظر اور جمالیاتی اُسلوب جملے کی تاثر پذیری کی دلیل ٹھہرتا ہے، کیوں کہ جملے کی قواعدی یا غیر قواعدی ترتیب ایک ایسے آہنگ سے پھوٹتی ہے، جو جملے کو ایک مخصوص ردھم، آہنگ اور بیان کے تلازماتی رنگ سے معمور رکھتی ہے اور یوں جملے کا پورا صوتی آہنگ معنوی اکائی کو اسلوب کی نادرہ کاری اور اندازِ اظہار کی انفرادیت سے ملا دیتا ہے۔ اس سے ایک طرف زبان کی کیفیت یا احساس سُر تال سے وابستہ ہوتے ہوئے اسے صوتیاتی اسلوب سے مملو کرتا ہے، تو دوسری جانب اس کی مخصوص معنوی فضا اس کی کلی معنویت کو منکشف کرنے کا جتن کرتی ہے۔ اس سے زبان اور اسلوب کی مخصوص، مگر مکمل صورت اور معنویت کا پورا دائرہ بن جاتا ہے۔ افتخار عارف کا یہ ایک نثری اقتباس ملاحظہ ہو، جس میں وہ خود بھی نثری آہنگ میں لفظ اور اس کی اسلوبیاتی تاثر پذیری کا کس انداز سے اظہار کر رہے ہیں:

> ''بہ حیثیت نثر نگار کے جو بات سب سے زیادہ مجھے متاثر کرتی ہے، وہ لفظوں کے استعمال اور انتخاب میں ان کی ہنروری ہے۔ ایک لفظ بھی جو انھوں نے کسی جملے میں صرف کیا ہو، نکال دیں، تو جملے کا پورا اسٹرکچر متاثر ہو جاتا ہے۔ فقرہ نکال دیں، تو پیرے کا اسٹرکچر متاثر ہوتا ہے اور اگر پیرا نکال دیں، پورے مضمون کی ساخت پریشان ہو جائے گی۔'' (۹۴)

(۶)

افتخار عارف کے نثری اظہاریے کی ایک نمایاں جہت ان کی مکتوب نگاری بھی ہے۔ انھوں نے اس صنفِ اظہار کو اپنے شخصی اور نجی رویوں کی تعبیر کا اشاریہ بنایا اور اس میں اپنے حُسنِ خیال کے صد ہا رنگ تخلیق کیے۔ بقولِ رؤف امیر:

''مکتوب نگاری افتخار عارف کی شخصیت کا اہم ترین جزو ہے۔ بلا مبالغہ وہ مہینے میں ہزاروں نہیں، تو سیکڑوں خطوط ضرور لکھتے ہوں گے۔ کہیں تعزیتی اور کہیں تہنیتی نوع کے یہ خطوط پاکستان کے گاؤں گاؤں اور شہر شہر بھیجے جاتے ہیں اور اس کی قید بھی نہیں کہ کسی سے تعارف ہے یا نہیں۔'' (۹۵)

ہندوستان کے عزیزوں اور ادبی دوستوں کے نام ان کے خطوط کا ایک فائل میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ اس فائل میں محفوظ مکتوب الیہم کے حوالے سے ان کے خطوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

۱۔ پروفیسر انیس اشفاق (۳ خط) ۲۔ ذکیہ ظہیر (۱ خط)
۳۔ اقبال مجید (۲ خط) ۴۔ ڈاکٹر خلیق انجم (۲ خط)
۵۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (۳ خط) ۶۔ شارب ردولوی (۳ خط)
۷۔ کشمیری لال ذاکر (۱ خط) ۸۔ زبیر رضوی (۲ خط)
۹۔ خلیق ابراہیم خلیق (۲ خط) ۱۰۔ حمرا خلیق (۲ خط)
۱۱۔ تبسم نقی (۱ خط) ۱۲۔ شہریار (۱ خط)
۱۳۔ ظفر حسین زیدی (۱ خط) ۱۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی (۱ خط)
۱۵۔ محمد عتیق (۱ خط) ۱۶۔ افضال احمد (۱ خط)
۱۷۔ قرۃ العین حیدر (۱ خط) ۱۸۔ مغنی تبسم (۱ خط)
۱۹۔ نیر مسعود (۲ خط) ۲۰۔ فضیل جعفری (۱ خط)

یہ خط کیا ہیں؟ محبت، خلوص، دل کشی اور رعنائی احساس کا دیباچہ ہیں۔ افتخار عارف نے ان خطوں میں نجی اور ذاتی معاملات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور علمی و ادبی مسائل کا اظہار بھی: یہ خط ان کے ماضی کے حالات اور واقعات کا بیانیہ بھی ہیں اور ان کی زندگی کے موجودہ منظر نامے کے عکاس بھی؛ ان میں یادنگاری کی خوش بو بھی اور معنی آفرینی کے رنگ بھی؛ ان میں زندگی کی اُمنگ اور ترنگ بھی ہے اور اس کا سوز اور گداز بھی؛...... ان میں آنسوؤں کی پھوار بھی ہے اور

قہقہوں کی آبشار بھی۔ ذیل میں دو خطوں سے اقتباس دیکھیے کہ کس طرح ان کے حسنِ خیال کی مہک صفحۂ قرطاس کے جمالیاتی احساس کو معطر کر رہی ہے:

''جواب کا نہ آنا تمھاری طرف سے میرے تعلقِ خاطر کو نہ ختم کر سکا، نہ کم کر سکا۔ لکھنؤ سے ہی نہیں، ہندوستان میں جہاں کہیں سے بھی کوئی اردو دنیا سے تعلق رکھنے والا شخص کہیں مل جاتا ہے، تو اس سے تمھاری خیریت ضرور پوچھی جاتی ہے۔ تمھارے لیے، دُلہن کے لیے اور بیٹے کے لیے ہمیشہ دل سے دُعا نکلتی ہے۔ پروردگارِ عالم بحقِ محمدؐ و آلِ محمدؑ تم کو بہت مطمئن، بہت خوش اور بہت کامیاب رکھے۔ کل تمھارا خط دفتر سے واپسی پر فلیٹ کے پتے پر موصول ہوا۔ پڑھتا جاتا تھا اور اداس ہوتا جاتا تھا۔ میں اب عمر کے ۶۳ ویں برس میں ہوں۔ اس میں سے ۲۱ برس لکھنؤ میں گزرے۔ ۱۳ برس کراچی میں، ۱۳ برس لندن میں اور ۱۶ برس اسلام آباد میں گزارے گئے۔ لندن اور اسلام آباد کے دن، خدا کا شکر ہے کہ بہت اطمینان، بہت آسودگی اور بہت کامیابی کے دن کہے جا سکتے ہیں۔ کراچی کے دن زندگی کی دوڑ میں بہت محنت اور مسلسل کام کے دن تھے۔ اللہ کریم کے بے حساب اکرام و عنایات پر اور اپنے آپ پر یقین کے دن۔ یہ بہت تقویت، بہت سرشاری اور بہت طمانیت کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ میں گزاری گئی زندگی سب تمھارے سامنے ہے۔ بہت مشکل کے دن، مگر ایسے روز و شب کہ جس کی بنیاد پر بعد میں نمود و ظہور کرنے والی شخصیت کی بنیاد گزاری کی گئی۔ یادش بخیر! پلٹ کر دیکھتا ہوں تو اب ان لوگوں پر بھی پیار آتا ہے، جنھوں نے بہت تکلیفیں پہنچائیں۔ عرصہ ہوا، نوجوانی کے زمانے میں جب میں پاکستان ٹیلی وژن میں ایک سینئر عہدے پر کام کر رہا تھا، تو حضرتِ جوش

نے اپنے استاد جنابِ عزیز لکھنوی کے صاحبزادے کے لیے مجھے ایک سفارشی خط لکھا تھا۔ سرنامے کی عبارت میں لکھنؤ سے انتساب 'القاب و آداب' میں شامل تھا (اس کا خیال بھی آجاتا ہے، تو شرمندہ ہوتا ہوں)۔ خط میں دو رُباعیاں بھی درج تھیں۔ ایک رباعی تھی:

مکھڑوں سے پٹی راج دُلاری کلیاں
چوتھی کی دُلہن کی طرح پیاری کلیاں
دل کی نگری سے آہ بھرتی گزریں
کل رات کو لکھنؤ کی ساری کلیاں

تم نے خط میں وکٹوریہ اسٹریٹ کا ذکر کے مجھے رات بھر ان گلی کوچوں میں سرگرداں رکھا، جہاں بچپن گزرا تھا۔ ہمایوں کے بڑے بھائی علی ظفر مرحوم پبلک جونیئر اسکول میں میرے ساتھ پڑھتے تھے، جو کیتھے والے جناب کے گھر سے متصل واقع تھا (کیتھے والے جناب کا کیا نام تھا؟)۔ وہیں میرے دو ایسے ٹیچرز بھی رہتے تھے، جنھوں نے بچپن میں مجھے ٹیوشن پڑھا کر جوبلی کالج میں داخلے کے لیے تیاری کرائی تھی۔ مرحوم مصحف حسین نقوی اور مرحوم مونس حسین نقوی۔ کیتھے والے جناب ہی کے ہاں ایک نوجوان حامد صاحب بھی تھے، جو علاحدہ سے مجھے صرف انگریزی پڑھاتے تھے۔ ظفر کے ساتھ Interval میں یا اسکول کے بعد حضرت حکیم صاحب عالم مرحوم و مغفور کے ہاں پھیرا لگتا تھا، جہاں سے ہوتے ہوئے وکٹوریہ اسٹریٹ، بزازے، کاظم ہوٹل سے ہوتے ہوئے فرنگی محل اور وہیں سے جوہری محلے پہنچتا تھا۔ کبھی چوکی تک آکر وظیفۂ سادات کے دفتر کی برابر والی گلی سے حکیم وہاج الحق......؟ والی گلی سے ہوتا ہوا گھر

چلا جاتا تھا۔ چھتے کے قریب والی گلی میں ان دنوں بھی میرے دو بھائی اور پھوپھی کے بچے رہتے ہیں، جو گلی سوداگر کے امام باڑے سے ہوتی ہوئی پھول والی گلی پر ختم ہوتی ہے۔

وہ جو کل زیرِ قدم تھیں

اب وہ گلیاں دل میں ہیں

پندرہ سولہ برس اُدھر ایک بار میں اور بھائی رضا علی عابدی لندن سے لکھنؤ گئے تھے۔ 'دُور درشن' سے فارغ ہو کر اپنے ایک دوست گھنشیام داس گپتا کے گھر گول دروازے پہنچے۔ ٹیکسی میں عابدی بھائی سے میں مختلف علاقوں سے گزرے ہوئے بزرگوں کی نسبت سے محلوں کا تذکرہ کرتا ہوا جب گول دروازے پہنچا، تو ٹیکسی والے نے بہت افسردگی اور بہت حیرت کے ساتھ مجھے دیکھا اور جو کچھ کہا: اس کا بیان کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔ میں نے کراچی میں اور اسلام آباد میں جو زندگی کی خوشیاں دیکھی ہیں، ان کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی محبت اور اتنی عزت اور اتنی شہرت کہ کوئی بھی ایسی نعمت نہیں، جس کا میں نے تصور کیا ار وہ اللہ کریم نے مجھے عطا نہ کی ہو۔ پاکستان میں جو کچھ نعمتیں میسر آئیں، ان کا شکر ادا کرنے کے لیے کئی زندگیاں ناکافی ہیں۔ اجنبی سرزمین میں جہاں تمھیں تو معلوم ہے کہ کوئی بھی میرا اعزیز نہ تھا، نہ ہے جس سے زندگی کے کسی موڑ پر معاونت یا مدد کی توقع کی جا سکتی ہو، مگر پھر بھی مجھے ایسے ایسے لوگ میسر آئے، جو خون کے رشتوں سے زیادہ مددگار ثابت ہوئے۔ سلیم گیلانی، اسلم اظہر، فیض احمد فیض، الطاف گوہر، خواجہ شاہد حسین، یہ سب پنجابی تھے، مظہر الحق صدیقی کا تعلق سندھ سے تھا، مگر ان لوگوں نے زندگی کے ہر موڑ پر جس طرح میرا

ساتھ دیا، اس نے منہ بولے رشتوں پر میرے یقین کو ایسا مستحکم کر دیا ہے کہ اب زندگی بامعنی نظر آتی ہے۔ خون کے رشتوں نے جو سلوک کیا تھا، وہ سب تمھارے سامنے ہے۔ یہ نہیں ہے کہ لکھنؤ میں محبت میسر نہیں آئی۔ کتنے لوگ ہیں، جنھوں نے کس کس منزل میں کرم فرمایا۔ احتشام صاحب، شبیہ الحسن صاحب، رضوان علوی، نیرّ بھائی، اشفاق میاں، دو چار نام ایسے بھی ہیں، جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں اور پھر میرے زمانے کا لکھنؤ، تو تم سے ذرا پہلے کا لکھنؤ تھا۔ بکھر بھی رہا تھا؛ اجڑ بھی رہا تھا، مگر ابھی کچھ لوگ باقی تھے، جنھوں نے لکھنؤ کی تہذیبی خزاں کے دن دیکھے تھے۔ کیسے دن تھے؟ اختر علی تلہری، علی عباس حسینی، جعفر علی خاں اثر، یگانہ لکھنوی، مسعود حسن رضوی، یوسف حسین موسوی، علامہ سید علی نقی نقویؒ، سعید الملتؒ، نصیر الملتؒ، عمدۃ العلماء سید کلب حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، مجاز، نیاز فتح پوری، علامہ ابوالحسن ندویؒ، ڈاکٹر عبدالعلیم، رضا انصاری، آنند نرائن ملا، رادھا کمل مکھرجی، مہذب لکھنوی، سرفراز حسین خبیر، منظر سلیم، مرثیے کی روایت کے بے شمار افراد۔

روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجیے

تہذیبوں کے نوحے کب کسی نے لکھے ہیں؟ قرۃ العین حیدر نے کچھ یادیں محفوظ کر لی ہیں، مگر سچی بات یہ ہے کہ لکھنؤ کا حق اس سے کہیں زیادہ تھا:

یگانہ کم سے کم اتنی تو لاج رکھنی تھی
کہ لکھنؤ سے وفا اہلِ لکھنؤ کرتے

آغا باقر کے امام باڑے میں ایک بار میں سودا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا، تو معلوم ہوا کہ قبر کو سیلاب بہا لے گیا ہے۔ بچپن میں مشاہیر کی قبروں کے

کتبے پڑھنا میرا مشغلہ رہا تھا۔ اب کا تو کیا کہیے، محلوں تک کے نام یاد نہیں۔ پچھلے دنوں کسی ٹیلی وژن نیٹ ورک پر لکھنؤ میں ہونے والے کسی سانحے کی فلم چل رہی تھی۔ تمھارے گھر کے سامنے والی سڑک پر پولیس چوکی کی طرف کیمرے نے توجہ کی۔ تم یقین نہیں کرو گے، مجھ کو بگیا کے سامنے والی گلی کا نام یاد نہیں آیا۔ مرحومہ بہن کو فون کر کے پوچھا، تو اس نے بتایا تھا کہ وہ 'شاہ چھڑے' والی گلی تھی جس کو ہم 'چھا چھڑے' والی کہتے تھے۔ میں ان دنوں سوچ رہا ہوں کہ اپنی جیسی تیسی یادوں کو خودنوشت سوانح کی شکل میں جمع کرلوں۔ اسی غرض سے میں نے کچھ مواد جمع کرنا شروع کیا ہے۔ لکھنؤ والے ہمیشہ کے بے وفا ہیں۔ میں نے زندگی میں آج تک شاید ہی کوئی لکھنوی دیکھا ہوگا، جس نے وعدہ وفا کیا ہو۔ عازم حسین صاحب یہاں آئے تھے، جن کے ہاتھ میں نے آپ کے لیے کتاب بھیجی تھی۔ میں نے ان سے لکھنؤ کی تہذیب عزاداری کے بارے میں کوئی کتاب یا مواد بھجوانے کا کہا تھا، مگر وہ بالکل غائب ہو گئے۔ ہمایوں سے بھی کہا تھا، مرحوم والی آسی سے بھی ایک دفعہ اس کا تذکرہ کیا تھا، مگر کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ کشور ہندوستان آتی رہتی ہے، میں اس کے ہاتھ تمھیں پیسے بھجواؤں گا، تم میرے مزاج کو سمجھتے ہو اور میری افتادِ طبع سے بھی واقف ہو، مجھے اس سلسلے کا کچھ مواد بھجوا دیں۔ مرحوم مشفق خواجہ جب تک زندہ تھے، بڑی تقویت تھی، لکھنویات پر جتنی کتابیں ان کے ذخیرے میں تھیں، شاید ہی کہیں اور ہوں، لیکن میں کوئی ریسرچ کا آدمی تو ہوں نہیں کہ وہاں تلاش کرتا۔ تم لکھنؤ پر اور کم از کم لکھنؤ کی تہذیب پر کچھ مواد مجھے ضرور بھجوا دو۔ اشفاق میاں سے کہنا کہ وہ مضمون جس کا تم نے خط

میں ذکر کیا ہے، وہ مجھے ضرور بھجوا دیں اور تم بھی اپنی یادداشتیں مجھے بھجواؤ۔
پچھلے دنوں میں نے ثاقب لکھنوی کی کتاب کی رونمائی میں ایسے ہی دو چار باتیں کہہ دی تھیں، تو خیال آیا کہ مجھے اس طرح توجہ دینی چاہیے، مگر کون جانے اب اس کی ضرورت ہے بھی کہ نہیں۔
زوالِ سلطنتِ اودھ ایک تاریخی المیہ بھی ہے اور تہذیبی سانحہ بھی۔ اس تہذیب میں بے شمار خرابیاں تھیں، مگر اردو زبان کی ثروت مندی میں اس کی دین سے کون انکار کرسکتا ہے؟'' (۹۶)
''پچھلے چند دنوں سے زلزلے کے سبب پاکستان اور بالخصوص اسلام آباد کی فضا بہت سوگوار رہی اور میں دفتری امور میں اتنا الجھا رہا کہ فوری طور پر جواب نہ دے سکا، مگر خط ہر وقت فوری جوابات دیے جانے والے خانے میں رکھا رہا اور آپ کی طرف دھیان بھی مسلسل رہا۔ ۱۹۶۵ء میں جب میں لکھنؤ سے کراچی کے لیے نکل رہا تھا، غالباً آپ چودھری گڑھیا والا گھر تبدیل کر چکے تھے، بس یونہی سا یاد پڑتا ہے۔ آپ کے گھر سے بالکل متصل گھر میں میرے بچپن کے ایک دوست اسلام رہتے تھے اور ذرا آگے پھاٹک میں جہاں اب برادرِ مکرم قیصر تمکین کے چھوٹے بھائی اور میرے بچپن کے دوست ابراہیم علوی رہتے ہیں۔ ایک اور خاندان میں بھی آنا جانا رہتا تھا۔ آپ کے گھر سے ملی ہوئی گلی میں میرے دو دوست رہتے تھے، ایک کا نام رفیق تھا جو احاطے میں رہتے تھے اور ایک مشہدی سادات کے گھرانے کا نوجوان غالباً حسینی نام تھا:

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

لکھنؤ، کراچی، نیویارک ،لندن، اسلام آباد میں پڑاؤ کرتی ہوئی زندگی مسلسل سفر میں گزر گئی...... یہ سب بہت آسودہ اور بہت کامیاب زندگی کا گوشوارہ ہے۔ محنت، استعداد، مواقع ،ان سب کی توفیق اللہ کریم کی طرف سے ،مگر سفر کے آخر میں طمانیت کے ساتھ ساتھ ایک اکیلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ بہت عزت، بہت شہرت، بہت نام ونمود اپنے جلو میں شدید احساس تنہائی لیے ہوئے ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور دُعا کرتا رہتا ہوں کہ زندگی کے باقی دن عزت وآبرو کے ساتھ ختم ہوں،تو کیسا اچھا ہو۔ کتابیں چھپتی رہتی ہیں، یہ سفر تو آپ کے علم میں ہوگا۔ اس دوران ہندوستان آنا تو ہوا، مگر ہوتا یہ ہے کہ دلّی آئے، وہاں سے لکھنؤ گئے، ہفتہ دس دن قیام رہا اور پھر واپس آ گئے۔ ملازمت اس سے زیادہ کی مہلت نہیں دیتی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دو برس کی ملازمت میں مزید توسیع ہوئی ہے، وگرنہ ارادہ تھا کہ ہم آتے اور اپنی مرضی سے بچھڑے ہوئے بزرگوں اور دوستوں کو دیکھ اور مل لیتے۔'' (۹۷)

یہ طویل اقتباس...... جہاں ایک طرف ان کی یادوں کی خوشبو سے معطر ہیں، وہیں دوسری جانب ان کے حسنِ تحریر کی اسلوبیاتی رعنائی کا اشاریہ بھی ہیں۔ڈاکٹر خورشید الاسلام کے بہ قول:

''خطوں میں ہمارے لیے وہی کشش ہوتی ہے، جو ہمارے لیے ہمارے دوستوں میں ہوتی ہے...... خطوں کو نجی ہونا چاہیے۔نجی خطوں میں رنگارنگی، دل چسپی ،تنوع اور عمومیت پیدا کرنا اچھے مکتوب نگار کا کام ہے۔'' (۹۸)

کیوں کہ رنگارنگی،تنوع، دل چسپی اور دل کشی کے منظر وہی مکتوب نگار تخلیق کر سکتا ہے، جسے زندگی کا عرفان بھی ہو اور مکتوب الیہ سے محبت بھی، جو دولتِ اعتماد اور اعتبار سے محروم نہ ہو اور اسے اپنے اور مکتوب الیہ کی محبت کا یقین بھی ہو، وگرنہ خط حجاب اور پردے کی اوٹ میں کہیں گم ہو

کر رہ جاتے ہیں اور دلی جذبات اور احساسات کا اظہاریہ نہیں بن سکتے۔

(۷)

رؤف امیر نے اپنی کتاب میں افتخار عارف کے جن مضامین کا تجزیہ کیا ہے، ان کی تفصیل:

۱۔ یاور مہربان و مشفق: یاور مہدی

۲۔ نعت

۳۔ فراتِ وقت کا شاعر: محسن نقوی

۴۔ نسیم حجازی: اسلامی تاریخی ناول کا ایک بڑا نام

۵۔ صندل کی آگ (صبا جاوید کا مجموعہ کلام)

۶۔ محبتیں جب شمار کرنا (نوشی گیلانی)

۷۔ افسانہ آدمی ہے (بشریٰ رحمٰن)

۸۔ تہذیب کے زخم (بیگم ثاقبہ رحیم الدین)

۹۔ درِ امکاں (مقصود وفا)

۱۰۔ قرآن منظوم بہ زبانِ اردو (نیساں اکبر آبادی)

۱۱۔ پاکستان ٹیلی وژن کا ارتقائی سفر

۱۲۔ شوق ستارہ (جلیل عالی)

ان مضامین کے ساتھ ساتھ مجھے ان کے حسبِ ذیل مضامین تک رسائی ہوئی، جو یا تو رؤف امیر کی کتاب کی تحریر و اشاعت کے بعد لکھے گئے یا پھر ان کی نظر سے پنہاں رہے:

۱۔ جون ایلیا

۲۔ ادب، کلچر اور روشن خیالی

۳۔ میری پسندیدہ کتابیں

۴۔ تصوف

۵۔ علامہ اقبال

۶۔ واصف علی واصف

۷۔ برصغیر میں تہذیبِ عزاداری

۸۔ Sufism and the world crisis

۹۔ Some Aspects of Pakistani Literature

یہ ممکن ہے کہ متذکرہ بالا مضامین کے علاوہ بھی انھوں نے کچھ مضامین لکھے ہوں، جو میری دسترس میں نہ آسکے ہوں، بہرحال اگر انھیں مضامین پر بھی اکتفا کیا جائے، تو ان کی تعداد اکیس ہے۔ میرے علم اور مطالعے کی حد تک ہنوز یہ تمام مضامیں غیر مطبوعہ ہیں...... اگر یہ مضامین کتابی صورت میں جلوہ گر ہو جائیں، تو یقیناً صاحبانِ نظر ان مضامین کے فکری، تنقیدی اور معنوی اُسلوب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

(انتخابِ کلام)

(۱)

حجابِ شب میں تب و تابِ خواب رکھتا ہے
درونِ خواب ہزار آفتاب رکھتا ہے

کبھی خزاں میں کھلاتا ہے رنگ رنگ کے پھول
کبھی بہار کو بے رنگ و آب رکھتا ہے

کبھی زمین کا منصب بلند کرتا ہے
کبھی اسی پہ بنائے عذاب رکھتا ہے

کبھی یہ کہتا ہے، سورج ہے روشنی پہ گواہ
کبھی اسی پہ دلیلِ حجاب رکھتا ہے

کبھی فغاں کی طرح رایگاں اثاثۂ حرف
کبھی دُعا کی طرح مستجاب رکھتا ہے

کبھی برستے ہوئے بادلوں میں پیاس ہی پیاس
کبھی سراب میں تاثیرِ آب رکھتا ہے

بشارتوں کی زمینیں جب آگ اگلتی ہیں
اس آگ ہی میں گُلِ انقلاب رکھتا ہے

میں جب بھی صبح کا انکار کرنے لگتا ہوں
تو کوئی دل میں مرے آفتاب رکھتا ہے

سوال اٹھانے کی توفیق بھی اسی کی عطا
سوال ہی میں جو سارے جواب رکھتا ہے

میں صابروں کے قبیلے سے ہوں مگر میرا رب
وہ محتسب ہے کہ سارے حساب رکھتا ہے

(۲)

اپنے آقاؐ کے مدینے کی طرف دیکھتے ہیں
دل الجھتا ہے تو سینے کی طرف دیکھتے ہیں

اب یہ دنیا جسے چاہے اسے دیکھے سرِ سیل
ہم تو بس ایک سفینے کی طرف دیکھتے ہیں

عہدِ آسودگیٔ جاں ہو کہ دورِ ادبار
اسی رحمت کے خزینے کی طرف دیکھتے ہیں

وہ جو پل بھر میں سرِ عرشِ بریں کھلتا ہے
بس اسی نور کے زینے کی طرف دیکھتے ہیں

بہرِ تصدیق سند نامۂ نسبت عُشاق
مہرِ خاتم کے نگینے کی طرف دیکھتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھے ہیں وہ آشفتہ مزاج
جو حرم سے بھی مدینے کی طرف دیکھتے ہیں

(۳)

مدینے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا
جلال ایسا کہ دل سینے سے نکلا جا رہا تھا

مثالِ فردِ عصیاں تھی کتابِ عمرِ رفتہ
کوئی مجھ میں تھا جو صفحے الٹتا جا رہا تھا

بلاوے پر یقیں تھا اور قدم اٹھتے نہیں تھے
عجب سیلِ الم آنکھوں میں امڈا آ رہا تھا

ہر اک بولا ہوا جملہ، ہر اک لکھا ہوا لفظ
لہو میں گونجتا تھا اور قیامت ڈھا رہا تھا

اور ایسے میں اُسی اک نام نے کی دستگیری
وہی جو منتہائے ہر دُعا بنتا رہا تھا

بہت نا مطمئن آنکھیں اچانک جاگ اٹھیں
کوئی جیسے دلِ کم فہم کو سمجھا رہا تھا

مدینہ سامنے تھا، منتظر تھا دَرِ سخی کا
دلِ آزردہ اپنے بخت پر اِترا رہا تھا

دُعا بعد از دُعا، سجدہ بہ سجدہ، اشک دَر اشک
میں مشتِ خاک تھا اور پاک ہوتا جا رہا تھا

(۴)

حسینؑ! تم نہیں رہے تمھارا گھر نہیں رہا
مگر تمھارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

مدینہ و نجف سے کربلا تک ایک سلسلہ
اِدھر جو آ گیا وہ پھر اِدھر اُدھر نہیں رہا

صدائے استغاثۂ حسینؑ کے جواب میں
جو حرف بھی رقم ہوا وہ بے اثر نہیں رہا

صفیں جمیں تو کربلا میں بات کھل کے آ گئی
کوئی بھی حیلۂ نفاق کار گر نہیں رہا

بس ایک نام ...... انؑ کا نام اور انؑ کی نسبتیں
جز ان کے پھر کسی کا دھیان عمر بھر نہیں رہا

کوئی بھی ہو کسی طرف کا ہو کسی نسب کا ہو
جو تم سے منحرف ہوا وہ معتبر نہیں رہا

(۵)

یہ نقش ہم جو سرِ لوحِ جاں بناتے ہیں
کوئی بناتا ہے ہم خود کہاں بناتے ہیں

سمندر اس کا، ہوا اس کی، آسماں اس کا
وہ جس کے اذن سے ہم کشتیاں بناتے ہیں

زمیں کی دھوپ، زمانے کی دھوپ، ذہن کی دھوپ
ہم ایسی دھوپ میں بھی سائباں بناتے ہیں

خود اپنی خاک سے کرتے ہیں موجِ نور کشید
پھر اس سے ایک نئی کہکشاں بناتے ہیں

کہانی جب نظر آتی ہے ختم ہوتی ہوئی
وہیں سے ایک نئی داستاں بناتے ہیں

کھلی فضا میں خوش آواز طائروں کے ہجوم
مگر وہ لوگ جو تیر و سناں بنتے ہیں

'پلٹ کے آئے غریب الوطن پلٹنا تھا'
یہ دیکھنا ہے کہ اب گھر کہاں بناتے ہیں

(۶)

پسِ گردِ جادۂ دردِ نور کا قافلہ بھی تو دیکھتے
جو دلوں سے ہو کے گزر رہا ہے وہ راستہ بھی تو دیکھتے

یہ دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے، وہ جو آگ تھی وہ کہاں کی تھی
کبھی راویانِ خبر زدہ پسِ واقعہ بھی تو دیکھتے

یہ گلو گرفتہ و بستۂ رسنِ جفا، مرے ہم قلم!
کبھی جابروں کے دلوں میں خوفِ مکالمہ بھی تو دیکھتے

یہ جو پتھروں میں چھپی ہوئی ہے شبیہ، یہ بھی کمال ہے
وہ جو آئینے میں ہمک رہا ہے وہ معجزہ بھی تو دیکھتے

جو ہوا کے رخ پہ کھلے ہوئے ہیں وہ بادباں تو نظر میں ہیں
وہ جو موجِ خوں سے الجھ رہا ہے وہ حوصلہ بھی تو دیکھتے

یہ جو آبِ زر سے رقم ہوئی ہے یہ داستان بھی مستند
وہ جو خونِ دل سے لکھا گیا ہے وہ حاشیہ بھی تو دیکھتے

میں تو خاک تھا کسی چشمِ ناز میں آ گیا ہوں تو مہر ہوں
مرے مہرباں کبھی اک نظر مرا سلسلہ بھی تو دیکھتے

(۷)

حبسِ شب ہو، تو اُجالے بھی ترے شہر سے آئیں
خواب دیکھوں تو حوالے بھی ترے شہر سے آئیں

تیرے ہی شہر میں سر تن سے جُدا ہو جائے
خُون بہا مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں

بات تو جب ہے کہ اے گریہ گُنِ خدمتِ حرف
مدحِ قاتل میں مقالے بھی ترے شہر سے آئیں

محضرِ جاں طلبی پر بھی ترے نام کی مُہر
جان سے جاؤں تو نالے بھی ترے شہر سے آئیں

وقت اگر بیعتِ ہر سنگ پہ اصرار کرے
آئینہ مانگنے والے بھی ترے شہر سے آئیں

(۸)

مرے خدا مرے لفظ و بیاں میں ظاہر ہو
اسی شکستہ و بستہ زباں میں ظاہر ہو

زمانہ دیکھے مرے حرفِ باریاب کے رنگ
گُلِ مرادِ ہنر دشتِ جاں میں ظاہر ہو

میں سرخرو نظر آؤں، کلام ہو کہ سکوت
تری عطا مرے نام و نشاں میں ظاہر ہو

مزہ تو جب ہے کہ اہلِ یقیں کا سرِ کمال
ملامتِ سخنِ گمرہاں میں ظاہر ہو

گزشتگانِ محبت کا خوابِ گم گشتہ
عجب نہیں شبِ آیند گاں میں ظاہر ہو

پسِ حجاب ہے اک شہسوارِ وادیٔ نور
کسے خبر اسی عہدِ زیاں میں ظاہر ہو

(۹)

خوابِ دیرینہ سے رخصت کا سبب پوچھتے ہیں
چلیے پہلے نہیں پوچھا تھا، تو اب پوچھتے ہیں

کیسے خوش طبع ہیں اس شہرِ دل آزار کے لوگ
موجِ خوں سر سے گزر جاتی ہے تب پوچھتے ہیں

اہلِ دنیا کا تو کیا ذکر کہ دیوانوں کو
صاحبانِ دلِ شوریدہ بھی کب پوچھتے ہیں

خاک اڑاتی ہوئی راتیں ہوں کہ بھیگے ہوئے دن
اوّلِ صبح کے غم آخرِ شب پوچھتے ہیں

ایک ہم ہی تو نہیں ہیں، جو اٹھاتے ہیں سوال
جتنے ہیں خاک بسر شہر کے سب پوچھتے ہیں

یہی مجبور، یہی مہر بلب، بے آواز
پوچھنے پر کبھی آئیں، تو غضب پوچھتے ہیں

کرمِ مسند و منبر کہ اب اربابِ حکم
ظلم کر چکتے ہیں تب مرضیِ رب پوچھتے ہیں

(۱۰)

ہم اپنے رفتگاں کو یاد رکھنا چاہتے ہیں
دلوں کو درد سے آباد رکھنا چاہتے ہیں

مبادا مندمل زخموں کی صورت بھول ہی جائیں
ابھی کچھ دن یہ گھر برباد رکھنا چاہتے ہیں

بہت رونق تھی ان کے دم قدم سے شہرِ جاں میں
وہی رونق ہم ان کے بعد رکھنا چاہتے ہیں

بہت مشکل زمانوں میں بھی ہم اہلِ محبت
وفا پر عشق کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں

سروں میں ایک ہی سودا کہ لو دینے لگے خاک
امیدیں حسبِ استعداد رکھنا چاہتے ہیں

کہیں ایسا نہ ہو حرفِ دُعا مفہوم کھو دے
دعا کو صورتِ فریاد رکھنا چاہتے ہیں

قلم آلودۂ نان و نمک رہتا ہے پھر بھی
جہاں تک ہوسکے آزاد رکھنا چاہتے ہیں

(۱۱)

وحشت کا اثر خواب کی تعبیر میں ہوتا
اک جاگنے والا مری تقدیر میں ہوتا

اک عالمِ خوبی ہے میسر مگر اے کاش
اس گُل کا علاقہ مری جاگیر میں ہوتا

اس آہوئے رم خوردہ و خوش چشم کی خاطر
اک حلقۂ خوشبو مری زنجیر میں ہوتا

مہتاب میں اک چاند سی صورت نظر آتی
نسبت کا شرف سلسلۂ میر میں ہوتا

مرتا بھی جو اس پر تو اسے مار کے رکھتا
غالب کا چلن عشق کی تقصیر میں ہوتا

اک قامتِ زیبا کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہے
ہوتا تو مرے حرفِ گرہ گیر میں ہوتا

(۱۲)

شہرِ گُل کے خس و خاشاک سے خوف آتا ہے
جس کا وارث ہوں اُسی خاک سے خوف آتا ہے

شکل بننے نہیں پاتی کہ بگڑ جاتی ہے
نئی مٹی کو نئے چاک سے خوف آتا ہے

وقت نے ایسے گھمائے افق، آفاق کہ بس
محورِ گردشِ سفاک سے خوف آتا ہے

یہی لہجہ تھا کہ معیارِ سخن ٹھہرا تھا
اب اسی لہجۂ بے باک سے خوف آتا ہے

آگ جب آگ سے ملتی ہے تو لو دیتی ہے
خاک کو خاک کی پوشاک سے خوف آتا ہے

قامتِ جاں کو خوش آیا تھا کبھی خلعتِ عشق
اب اسی جامۂ صد چاک سے خوف آتا ہے

کبھی افلاک سے نالوں کے جواب آتے تھے
اِن دنوں عالمِ افلاک سے خوف آتا ہے

رحمتِ سیدِ لولاکؐ پہ کامل ایمان
امتِ سیدِ لولاکؐ سے خوف آتا ہے

(۱۳)

اِنھیں میں جیتے اِنھیں بستیوں میں مر رہتے
یہ چاہتے تھے مگر کس کے نام پر رہتے

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

پرندے جاتے نہ جاتے پلٹ کے گھر اپنے
پر اپنے ہم شجروں سے تو باخبر رہتے

بس ایک خاک کا احسان ہے کہ خیر سے ہیں
وگرنہ صورتِ خاشاک در بدر رہتے

مرے کریم! جو تیری رضا مگر اِس بار
برس گزر گئے شاخوں کو بے ثمر رہتے

(۱۴)

ہم اہلِ جبر کے نام و نسب سے واقف ہیں
سروں کی فصل جب اُتری تھی تب سے واقف ہیں

کبھی چھپے ہوئے خنجر، کبھی کھنچی ہوئی تیغ
سپاہِ ظلم کے ایک ایک ڈھب سے واقف ہیں

وہ جن کی دستخطیں محضرِ ستم پہ ہیں ثبت
ہر اُس ادیب، ہر اُس بے ادب سے واقف ہیں

یہ رات یوں ہی تو دشمن نہیں ہماری کہ ہم
درازئ شبِ غم کے سبب سے واقف ہیں

نظر میں رکھتے ہیں عصرِ بلند بامِ مہر
فراتِ جبر کے ہر تشنہ لب سے واقف ہیں

کوئی نئی تو نہیں حرفِ حق کی تنہائی
جو جانتے ہیں وہ اس امرِ رب سے واقف ہیں

(۱۵)

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

گھر کی وحشت سے لرزتا ہوں مگر جانے کیوں
شام ہوتی ہے تو گھر جانے کو جی چاہتا ہے

ڈوب جاؤں تو کوئی موج نشاں تک نہ بتائے
ایسی ندی میں اُتر جانے کو جی چاہتا ہے

کبھی مل جائے تو رستے کی تھکن جاگ پڑے
ایسی منزل سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے

وہی پیماں جو کبھی جی کو خوش آیا تھا بہت
اُسی پیماں سے مکر جانے کو جی چاہتا ہے

مکالمہ

''ہوا کے پردے میں کون ہے، جو چراغ کی لو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
جو خلعتِ انتساب پہنا کے وقت کی رو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا
حجاب کو رمزِ نور کہتا ہے اور پرتو سے کھیلتا ہے
کوئی تو ہوگا''
''کوئی نہیں ہے
کہیں نہیں ہے
یہ خوش یقینوں کے، خوش گمانوں کے واہمے ہیں جو ہر سوالی سے بیعتِ اعتبار لیتے ہیں
اس کو اندر سے مار دیتے ہیں''
''تو کون ہے؟ وہ جو لوحِ آبِ رواں پر سورج کو ثبت کرتا ہے اور بادل اُچھالتا ہے
جو بادلوں کو سمندروں پر کشید کرتا ہے اور بطنِ صدف میں خورشید ڈھالتا ہے

وہ سنگ میں آگ، آگ میں رنگ، رنگ میں روشنی کے امکان رکھنے والا
وہ خاک میں صوت، صوت میں حرف، حرف میں زندگی کے سامان رکھنے والا

نہیں کوئی ہے
کہیں کوئی ہے
کوئی تو ہوگا''

کربلا گواھی دے

کربلا گواہی دے
فاطمہؑ کی بیٹی نے
باپ کی شجاعت کو
صبر سے بدل ڈالا
بھائی کی رفاقت کا
حق ادا کیا کیسا
کربلا گواہی دے
بابِ شہرِ حکمت سے
خیمہ گاہِ نُصرت تک
محضرِ شہادت تک
کیسے کیسے نام آئے
کیا عجب مقام آئے
حق کی پاسداری کو
فرض جاننے والے
راہِ حق میں کام آئے

ساتھ ساتھ تھی زینبؑ
کربلا گواہی دے

☆

پھر وہ شام بھی آئی
جب بہن اکیلی تھی
اک سفر ہوا انجام
ریگِ گرمِ مقتل پر
چند بے کفن لاشے
بھائیوں بھتیجوں کے
گودیوں کے پالوں کے
ساتھ چلنے والوں کے
ساتھ دینے والوں کے
کچھ جلے ہوئے خیمے
کچھ ڈرے ہوئے بچے
جن کا حوصلہ زینبؑ

☆

مشہدِ مقدس سے
اک نیا سفر آغاز
جس کی ایک منزل شام
شام شامِ مظلومی
اور وہ خطبۂ زینبؑ
پھر تو برسرِ دربار

پوچھنے لگی دنیا
ظلم کی کہانی میں
داستاں سراؤں کے
حاشیے کہاں تک ہیں
سوچنے لگی دُنیا
منبرِ سلونی کے
سلسلے کہاں تک ہیں
خیر کے تحفظ پر
گھر لٹانے والوں کے
حوصلے کہاں تک ہیں
وقت نے گواہی دی
جبر کے مقابل میں
صبر کا سبق زینبؑ
مصحفِ شہادت کا
آخری ورق زینبؑ

☆

یہ جو دردِ محکم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے
یہ جو آنکھ پُرنم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے
یہ جو فرشِ ماتم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے

سلامی

(چند مصرعے شہید عزیز بھٹی کے لیے)

سیاہیٔ شبِ ظلمت میں اک لہو کی لکیر
کھنچی اور ایسی کہ اب تک ہے روشنی ہر سمت
قلم کہ جس نے قصیدوں سے انحراف کیا
یہ چاہتا ہے کہ اس خون کو سلامی دے
(جزائے خیر و خراجِ بلند نامی دے)
جو خاکِ پاک کی نسبت سے ارجمند ہوا
مثالِ پرچمِ سر سبز سر بلند ہوا

اور ھوا چپ رھی

شاخِ زیتون پر کم سخن فاختاؤں کے اتنے بسیرے اُجاڑے گئے
اور ہوا چپ رہی
بے کراں آسمانوں کی پہنائیاں بے نشیمن شکستہ پروں کے تگ و تاز پر بین کرتی رہیں
اور ہوا چپ رہی
زرد پرچم اُڑاتا ہوا لشکرِ بے اماں گُل زمینوں کو پامال کرتا رہا
اور ہوا چپ رہی
آرزو مند آنکھیں، بشارت طلب دل، دعاؤں کو اُٹھے ہوئے ہاتھ سب بے ثمر رہ گئے
اور ہوا چپ رہی
اور تب حبس کے قہرماں موسموں کے عذاب ان زمینوں پہ بھیجے گئے
اور مُنادی کرا دی گئی
جب کبھی رنگ کی، خوشبوؤں کی اُڑانوں کی، آواز کی اور خوابوں کی توہین کی جائے گی
یہ عذاب ان زمینوں پہ آتے رہیں گے

بدشگونی

عجب گھڑی تھی

کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی

چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں الجھے آنسو بلا رہے تھے

مگر مجھے ہوش ہی کہاں تھا

نظر میں اک اور ہی جہاں تھا

نئے نئے منظروں کی خواہش میں اپنے منظر سے کٹ گیا ہوں

نئے نئے دائروں کی گردش میں اپنے محور سے ہٹ گیا ہوں

صلہ، جزا، خوف، ناامیدی

اُمید، امکان، بے یقینی

ہزار خانوں میں بٹ گیا ہوں

اب اس سے پہلے کہ رات اپنی کمند ڈالے یہ چاہتا ہوں کہ لوٹ جاؤں

عجب نہیں وہ کتاب اب بھی وہیں پڑی ہو

عجب نہیں آج بھی مری راہ دیکھتی ہو

چمکتے لفظوں کی میلی آنکھوں میں اُلجھے آنسو

ہوا و حرص و ہوس کی سب گرد صاف کر دیں

عجب نہیں میرے لفظ مجھ کو معاف کر دیں

عجب گھڑی تھی

کتاب کیچڑ میں گر پڑی تھی

کچھ دیر پہلے نیند سے

میں جن کو چھوڑ آیا تھا شناسائی کی بستی کے وہ سارے راستے آواز دیتے ہیں
نہیں معلوم اب کس واسطے آواز دیتے ہیں
لہو میں خاک اڑتی ہے
بدن، خواہش بہ خواہش، ڈھہ رہا ہے
اور نفس کی آمد و شد دل کی ناہمواریوں پر بین کرتی ہے
وہ سارے خواب ایک اک کر کے رخصت ہو چکے ہیں جن سے آنکھیں جاگتی تھیں
اور امیدوں کے روزن شہرِ آئندہ میں کھلتے تھے
بہت آہستہ آہستہ
اندھیرا دل میں، آنکھوں میں، لہو میں، بہتے بہتے جم گیا ہے
وقت جیسے تھم گیا ہے
بس اب ایک اور شب، ایک اور پل جب سارے رستے بند ہوں گے
وہ پل جب سارے بندھن، کھڑکیاں، آنگن، اُمیدیں، آرزوئیں، رنگ سب
آہنگ سارے خاک کا پیوند ہوں گے
ادھر کچھ دن سے جانے کیوں اُسی ساعت کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں
بچھڑنے روٹھنے والوں کو پھر سے لوٹ آنے کی دہائی دے رہی ہیں
مگر اب کون آئے گا، پلٹ کر کون آیا ہے جنھیں آنا تھا وہ تو آئے بھی اور
کب کے رخصت ہو چکے ہیں
میں سب کچھ جانتا بھی ہوں مگر پھر بھی
مری آنکھوں میں رستہ دیکھتے رہنے کی خُو اب بھی وہی ہے
تھکن سے چور ہوں پھر بھی سفر کی آرزو اب بھی وہی ہے

ایک رُخ

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں
گھوڑوں کی ٹاپوں میں روندی ہوئی روشنی
دریا سے مقتل تک پھیلی ہوئی روشنی
جلے ہوئے خیموں میں سہمی ہوئی روشنی
سارے منظر ایک طرح کے ہوتے ہیں
ایسے ہر منظر کے بعد اک سناٹا چھا جاتا ہے
یہ سناٹا طبل و عَلم کی دہشت کو کھا جاتا ہے
سناٹا فریاد کی لے ہے احتجاج کا لہجہ ہے
یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے، بہت پرانا قصہ ہے
ہر قصے میں صبر کے تیور ایک طرح کے ہوتے ہیں
وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں

خوف کے موسم میں لکھی گئی ایک نظم

وہ طائر جو کبھی اپنے پر و بال آزمانا چاہتے تھے
ہواؤں کے خد و خال آزمانا چاہتے تھے
آشیانوں کی طرف جاتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں
کون جانے کون سا صیاد کیسی وضع کے جال آزمانا چاہتا ہو
کون سی شاخوں پہ کیسے گل کھلانا چاہتا ہو

شکاری اپنے باطن کی طرح اندھے شکاری
حُرمتوں کے موسموں سے نابلد ہیں
اور نشانے مستند ہیں
جگمگاتی جاگتی شاخوں کو بے آواز رکھنا چاہتے ہیں
ستم گاری کے سب در باز رکھنا چاہتے ہیں
خداوندا! تجھے سہمے ہوئے باغوں کی سوگند
صداؤں کے ثمر کی منتظر شاخوں کی سوگند
اُڑانوں کے لیے پر تولنے والوں پر اک سایہ تحفظ کی ضمانت دینے والا
کوئی موسم بشارت دینے والا!

پتا نہیں کیوں؟

پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی کوئی خواب دیکھوں
تو رات میری امانتیں مہربان سورج کو سونپ جائے
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ جب دُعاؤں کو ہاتھ اُٹھیں تو
کوئی میرے بلند ہاتھوں میں پھول رکھ دے
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں کہ اب مرے عہد کے مقدر میں جتنے آنسو ہیں
میری آنکھوں میں جذب ہو جائیں اور ترکش میں تیر جتنے ہیں
میرے سینے میں ٹوٹ جائیں
پتا نہیں کیوں میں چاہتا ہوں۔!

ایک اُداس شام کے نام

عجیب لوگ ہیں
ہم اہلِ اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں
جورات جاگنے کی تھی وہ ساری رات
خواب دیکھ دیکھ کر گزارتے رہے
جونام بھولنے کا تھا اُس ایک نام کو
گلی گلی پکارتے رہے
جوکھیل جیتنے کا تھا وہ کھیل ہارتے رہے

عجیب لوگ ہیں

ہم اہلِ اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں
کسی سے بھی تو قرضِ آبرو ادا نہیں ہوا
لہولہان ساعتوں کا فیصلہ نہیں ہوا
برس گزر گئے ہیں کوئی معجزہ نہیں ہوا
وہ جل بجھا کہ آگ جس کے شعلۂ نفس میں تھی
وہ تیر کھا گیا کمان جس کی دسترس میں تھی
سیاہِ مہر کا فصیلِ شب کو انتظار ہے
کب آئے گا وہ شخص جس کا سب کو انتظار ہے
ہم اہلِ انتظار کتنے بدنصیب لوگ ہیں
عجیب لوگ ہیں
ہم اہلِ اعتبار کتنے بدنصیب لوگ ہیں

تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟

ہمارے سب خواب وقت کی بے لحاظ آندھی میں جل بجھیں گے
دونیم دریا و چاہِ تاریک و آتشِ سرد و جاں نوازی کے سلسلے ختم ہو گئے کیا؟
تو کیا کوئی معجزہ نہ ہوگا؟
خدائے زندہ! یہ تیری سجدہ گزار بستی کے سب مکینوں کی التجا ہے
کوئی تو ایسی سبیل نکلے کہ تجھ سے منسوب گُل زمینوں کی عظمتیں پھر سے لوٹ آئیں

وہ عفو کی، درگزر کی، مہر و وفا کی بھولی روایتیں پھر سے لوٹ آئیں
وہ چاہتیں - وہ رفاقتیں - وہ محبتیں پھر سے لوٹ آئیں

تراجم

افتخار عارف کی شاعری کے انگریزی، پشتو، سندھی، فارسی زبان میں تراجم۔

انگریزی تراجم

Translated by Brenda Walker

Translated by Sheeraz Bin Atta

پشتو تراجم

مترجم: سلمیٰ شاهین

مترجم :عبداللّٰه جان عابد

سنڌي تراجم

مترجم:سعیده دراني

فارسی تراجم

مترجم:ڈاکٹر انجم حمید،شهلا شهسوندی

پس چہ باید کرد...

خوابِ خس خانہ و برفاب کے پیچھے پیچھے
گرمیِ شہرِ مقدر کے ستائے ہوئے لوگ

کیسی یخ بستہ زمینوں کی طرف آ نکلے

موجِ خوں برف ہوئی جاتی ہے سانسیں بھی ہیں برف
وحشتیں جن کا مقدر تھیں وہ آنکھیں بھی ہیں برف
یادِ یارانِ دل آویز کا منظر بھی ہے برف
ایک اک نام، ہر آواز، ہر اک چہرہ برف
منجمد خواب کی ٹکسال کا ہر سکہ برف

اور اب سوچتے ہیں، شام و سحر سوچتے ہیں

خوابِ خس خانہ و برفاب سے وہ آگ بھلی
جس کے شعلوں میں بھی قرطاس و قلم زندہ ہیں
جس میں ہر عہد کے ہر نسل کے غم زندہ ہیں
خاک ہو کر بھی یہ لگتا تھا کہ ہم زندہ ہیں

☆

So what do we do now?

After dreams of cool houses and iced water,

People , distressed by the heat of Fate City,

Drift towards such frozen zones

Where both blood and breath turn to ice

And eyes destined to be wild are frozen,

The tempestuous sea of the unruly heart is frozen,

Even the warm memories of close friends are ice

Every name, every sound, every face-ice.

And now I ponder; day and night, thinking

That fire better than dreaming of cool houses and iced water,

That fire whose flames keep pen and paper alive

A fire which every moment keeps all the sufferings and every generation alive,

And where we still appear alive even when turned to dust.

(Translated by Brenda Walker)

ایک پَل کا فاصلہ

ایک پَل کا فاصلہ ہے
عشق اور آوارگی کے درمیاں بس ایک پَل کا فاصلہ ہے
ایک پَل کا فاصلہ ہے
شاخِ گُل پر شبنمِ وارفتہ کا پیہم نزول!

حرفِ پیماں درمیانِ جسم و جاں!
منزلِ دستِ دُعا بابِ قبول!
ایک پَل کا فاصلہ ہے
عشق اور آوارگی کے درمیاں بس ایک پَل کا فاصلہ ہے۔

☆

Distance is but a moment

The distance is but a moment,

Just a moment's distance between the love and the lusting.

The promise of that moment

Is like the dew that will never fail to shower the petals of every rose upon the branch,

Those words of total submission from the body and the soul.

Need only the grace of prayer to bind them,

Distance is but a moment,

Just a moment's distance between the love and the lusting.

(Translated by Brenda Walker)

پرانے دشمن

اِک سورج ہے جو شام ڈھلے مجھے پُرسا دینے آتا ہے
ان پھولوں کا جو میرے لہو میں کھلنے تھے کھلے نہیں
ان لوگوں کا جو کسی موڑ پہ ملنے تھے اور ملے نہیں
اک خوشبو ہے جو بستی بستی میرا پیچھا کرتی ہے
اور اپنے جی کی بات بتاتے ڈرتی ہے
اِک دریا ہے جو جنم جنم کی پیاس بجھانے آتا ہے
اور انگارے برساتا ہے
اور یہ سورج اور یہ خوشبو اور یہ دریا
مری آن بان کے بیری ہیں
سب میری جان کے بیری ہیں

☆

My old enemies

The sun comes every evening to give condolences

For those flowers that were meant to blossom in my blood, but culd't.

For those people who were meant to meet me on some turning point of life, yet could't.

There is a fragrance that follows man from one country

to the other, from one continent to the other,

Yet it never has the courage to tell me the secrets of its heart.

There is a river that flows ready to quench the thirst of

my times, the thirst of my generations,

Yet it shoots out molten lave in all directions,

And this sun, this fragrance, and this river,

All want to deprive me of my honour.

Each one ready to destroy me.

(Translated by Brenda Walker)

اعلان نامہ

میں لاکھ بزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں کہ جس کے بیٹوں نے
جو کہا اُس پہ جان دے دی
میں جانتا تھا مرے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی جائیں گی اور تماشائی
رقصِ شعلہ فشاں پر اصرار ہی کریں گے

میں جانتا تھا مرا قبیلہ بریدہ اور بے رِدا سروں کی گواہیاں
لے کے آئے گا پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے
سو میں کمیں گاہِ عافیت میں چلا گیا تھا
سو میں اماں گاہِ مصلحت میں چلا گیا تھا
اور اَب مجھے میرے شہسواروں کا خون آواز دے رہا ہے
تو نذرِ سر لے کے آ گیا ہوں
تباہ ہونے کو ایک گھر لے کے آ گیا ہوں
میں لاکھ بُزدل سہی مگر میں اُسی قبیلے کا آدمی ہوں!

The Proclamation

I may be a helpless coward but I belong to that very tribe whose sons offered their lives to uphold their pledge

I knew that the tents of my tribe would be burnt and the viewers would insist on seeing the dance of the burner

I knew that my bribe would come along with the testimony of cut heads or those without veils but the people would deny their evidence

So I took refuge in the hiding of peace

So I found shelter under the cover of compromise

And now my knight' blood is calling out

Thus I have brought the offering of my head

I have come along with a house to be ruined

I may be a helpless coward but I belong to the same tribe

(Translated by Sheeraz Bin Atta)

شہرِ علم کے دروازے پر

کبھی کبھی دِل یہ سوچتا ہے

نہ جانے ہم بے یقین لوگوں کو نامِ حیدر سے ربط کیوں ہے

حکیم جانے وہ کیسی حکمت سے آشنا تھا

شجیع جانے کہ بدر و خیبر کی فتح مندی کا راز کیا تھا

علیم جانے وہ علم کے کون سے سفینوں کا ناخدا تھا

مجھے تو بس صرف یہ خبر ہے

وہ میرے مولا کی خوشبوؤں میں رچا بسا تھا

وہ اُن کے دامانِ عاطفت میں پلا بڑھا تھا

اور اس کے دِن رات میرے آقا کے چشم و ابرو جنبشِ لب کے منتظر تھے

وہ رات کو دُشمنوں کے نرغے میں سو رہا تھا تو اُن کی خاطر

جدال میں سر سے پاؤں تک سرخ ہو رہا تھا تو اُن کی خاطر

سو اُس کو محبوب جانتا ہوں

سو اُس کو مقصود مانتا ہوں

سعادتیں اس کے نام سے ہیں

محبتیں اس کے نام سے ہیں

محبتوں کے سبھی گھرانوں کی نسبتیں اس کے نام سے ہیں!

At the Gate of the City of Knowledge

Sometimes, my within wonders

How we the doubters are related with the name of Haider (AS)

Only The Wise knows what a wisdom he had

The courageous knows what the secret of conquest of Badr and Khaiber was

The Knowledge knows what type of vessels he was the captain of I only know that

He was filled with the scents of my Master (PUBH)

He was brought up in his (PUBH) affectionate hands

And the days and nights of him were ever in search of a slight gesture of my Master's (PUBH) expression

Just for his (PUBH) sake he lay down to face the foes at night

Just for his (PUBH) sake he grew all red with anger in the battlefield

Hence I consider him my much-loved

Hence I believe him my destination

Virtues are due to his name

Loves are due to his name

The associations of all the homes of loves are due his name

(Translated by Sheeraz Bin Atta)

غزل

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو

میں اُس سے جھوٹ بھی بولوں تو مجھ سے سچ بولے
مرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو

میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرا ہو کے رہے
میں گر پڑوں تو مری پستیوں کا ساتھی ہو

وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے
گلی گلی مری رسوائیوں کا ساتھی ہو

کرے کلام جو مجھ سے تو میرے لہجے میں
میں چپ رہوں تو مرے تیوروں کا ساتھی ہو

میں اپنے آپ کو دیکھوں وہ مجھ کو دیکھے جائے
وہ میرے نفس کی گمراہیوں کا ساتھی ہو

وہ خواب دیکھے تو دیکھے مرے حوالے سے
مرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو

د افتخار عارف

دمشهور اُردو غزل په تاثر

داسې څوک وے چې د دردونو مې ملګرے هم وے
د سوی زړهٔ دحسرتونو مې ملګرے هم وے

چې ئی په خوب کښې هم زما دغم ليدل کړلے
د زمانې دګردشونو مې ملګرے هم وے

دے پستئ په بلندئ وے مقامی ما سره
د تاترين د ګړنګونو مې ملګری هم وے

زما کهٔ اوښکې په رخسار دبې وسئ بهېدې
د داسې ترمو بارانونو مې ملګرے هم وے

ورته عزيز وے قراری بې قراری مې دواړه
د دې مظلومو ارمانونو مې ملګری هم وے

کهٔ ئې تصوير هم جوړولے نوا پيکر وے زما
د فکر تهال کښې د خيالونو مې ملګرے هم وے

زهٔ چې شاهين يم هغه هم لکه شاهين هسې وے
د دنګو غرونو د سرونو مې ملګرے هم وے

(راوپل ۔مترجم: سلمیٰ شاهين)

ابوذر غفاریؓ کے لیے ایک نظم

سلام اُنؐ پر درُود اُنؐ پر

وہ کہہ رہے تھے

''زمیں نے بوجھ ایسے آدمی کا نہیں اُٹھایا جو تم سے سچا ہو اے ابوذرؓ ''

وہؐ کہہ رہے تھے

''فلک نے سایہ نہیں کیا ایسے آدمی پر جو تم سے سچا ہو اے ابوذرؓ ''

سبھی یسار و یمین تصدیق کر رہے تھے

تمام اہلِ یقین تصدیق کر رہے تھے

سلام اُنؐ پر درُود اُنؐ پر

مگر زمانے نے یہ بھی دیکھا

وہی مدینہ ہے اور ابوذرؓ ہیں اور منبر ہے اور منبر کا فیصلہ ہے

اور اب جو منبر کا فیصلہ ہے وہ قولِ صادقؐ سے مختلف ہے

جو قولِ صادقؐ سے مختلف ہے وہ فیصلہ میرے اور منبر کے درمیان

اک سوال بن کر ٹھہر گیا ہے

بہت زمانہ گزر گیا ہے مگر ابوذرؓ نگاہ میں ہیں

نگاہ میں ہیں

دمشق و بغداد و قرطبہ کے سلاسلِ مصلحت کی بخشش پہ پلنے والے تمام منبر

نگاہ میں ہیں

جہانِ مظلوم خوابِ دیگر کا منتظر ہے

نیا زمانہ نئے ابوذرؓ کا منتظر ہے

ابوذر غفاریؓ د پاره پېرزوٚنه

سلام ،سلام دے ،درود سلام دے
هغوی ﷺ وئیل دا
په مخ د زمکې
نیشته دے بل څوك دا سې رېښتونے لکه چې تهٔ یٔ اے
ابوذرهؓ
هغوی ﷺ وئیل دا
اسمان او نکړهٔ
سبورے پرے باندے ،نیشته دے بل څوك داسې رېښتونے
لکه چې تـهٔ یٔ اے ابوذرهؓ
دا څلور کوټه
د دنیا واړه
دغه تصدیق کړی
اهلِ یقین ټول
دغه تصدیق کړی
سلام ،سلام دے ،درود سلام دے
خوزمانې هم
ؤلیدو دا وخت
چې دا هم هاغه یو مدینه ده

او ابوذرؓ دے

هغه منبر دے

او د منبر هاغه يَو فېصله ده

اوس د منبر چې څهٔ فېصله ده

هغه د قول نه د پېغمبرﷺ مو، ده مختلفه

او چې د قول نه د پېغمبرﷺ مو، ده مختلفه

نو دا يو سوال دے بيا په خپل ځان کښې

د فېصلې هغې او منبر په ميان کښې

وختونه ډېر تېر

په دې کښې تېر شُو

خو ابوذرؓ مې داسې د سترګو

وړاندے ولاړ دے

د زوراورو د کمين ګاهو

د ننه هر رنګ سازش د جبر

منظر د ظلم

مې دا دے مخکښې

د سترګو وړاندې

راته ولاړ دے

دمشق د ښار او د بغداد

د قرطبې دا

بنديان قېديان

بندی بېړو کښې
د مصلحت دی په پېکړو کښې
راته د ستر ګو
وړاندې ولاړ دی
مظلوم جهان مې
په دے ارمان دے په انتظار دے
چې زمانې ته بیا ابوذرؓ مې پکار دے
(درد ګلونه ۔مترجم :عبدالله جان عابد)

محبت کی ایک نظم

مری زندگی میں بس اک کتاب ہے اک چراغ ہے

ایک خواب ہے اور تم ہو

یہ کتاب و خواب کے درمیان جو منزلیں ہیں، میں چاہتا تھا

تمھارے ساتھ بسر کروں

یہی کل اثاثۂ زندگی ہے اسی کو زادِ سفر کروں

کسی اور سمت نظر کروں تو مری دُعا میں اثر نہ ہو

مرے دل کے جادۂ خوش خبر پہ بجز تمھارے کبھی کسی کا گزر نہ ہو

مگر اِس طرح کہ تمھیں بھی اِس کی خبر نہ ہو

اسی احتیاط میں ساری عمر گزر گئی

وہ جو آرزو تھی کتاب و خواب کے ساتھ تم بھی شریک ہو، وہی مر گئی

اِسی کشمکش نے کئی سوال اٹھائے ہیں

وہ سوال جن کا جواب میری کتاب میں ہے نہ خواب میں

مرے دل کے جادۂ خوش خبر کے رفیق

تم ہی بتاؤ پھر کہ یہ کاروبارِ حیات کس کے حساب میں

مری زندگی میں بس اک کتاب ہے اک چراغ ہے

ایک خواب ہے اور تم ہو!

د محبت يو نظم

زما په ژوند کښې

چې يو کتاب دے چې يو چراغ دے
ته ئى او ئې او يادے خوب لاجواب دے
دا د کتاب او
د خوب په ميان کښې
چې منزلونه چې فاصلې دى
نو ماغو ښتل دا
تاسره ټېر کړم دغه و ختونه
دا به د ژوند مې کُل اثاثه وى
دابه دلارې سازو سامان وى
کۀ په بل لورى زما نظرشى
د زړۀ دعادے بيا بې اثر شى
د زړۀ په لاره په د غه لاره
بغېر له تا مې څوك نۀ دى ياره
او تۀ خبر هم له د غه نۀ ئۀ
په دې احتياط کښې
عمر مې تېر شو

چې څۀ ارمان وو
کتاب او خوب وو
ورسره تۀ هم
شريك وې ياره
يو ځائې د فن شو
دې اندېښنو کښې
دې وسوسو کښې
سوالونه ډېر ډېر
مخې ته راغلل
چې يو جواب ئې نۀ په کتاب کښې
نۀ مې په خوب کښې
موندے دے ياره
د زړۀ دلارې د دغه لارې
مګرى ياره ملګرى ياره
تۀ راته وايه څه کنه وايه
دا ژوند او کار مې
په کوم حساب کښې
دچاپۀ تہس کښې
زماپۀ ژوند کښې
که دى خودادى

چې يو کتاب دے

چې يو چراغ دے

تهٔ ئی او ئې او ياد ے

خوب لاجواب دے

(درد گلونه۔مترجم :عبداللّٰه جان عابد)

ابھی کچھ دن لگیں گے

دل ایسے شہر کے پامال ہو جانے کا منظر بھولنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
جہانِ رنگ کے سارے خس وخاشاک
سب سرو وصنوبر بھولنے میں، ابھی کچھ دن لگیں گے
تھکے ہارے ہوئے خوابوں کے ساحل پر، کہیں امید کا چھوٹا سا اک گھر
بنتے بنتے رہ گیا ہے
وہ اک گھر بھولنے میں، ابھی کچھ دن لگیں گے
مگر اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں
بس اک دن دل کی لوحِ منتظر پر
اچانک
رات اُترے گی
مری بے نور آنکھوں کے خزانے میں چھپے ہر خواب کی تکمیل کر دے گی
مجھے بھی خواب میں تبدیل کر دے گی
اک ایسا خواب جس کا دیکھنا ممکن نہیں تھا
اک ایسا خواب جس کے دامنِ صد چاک میں کوئی مبارک، کوئی روشن دن نہیں تھا
ابھی کچھ دن لگیں گے!

اجان ڪجهه ڏينهن لڳندا

اجان ڪجهه ڏينهن لڳندا
دل جي شهر برباد ٿي ويڙهه جو منظر وسارڻ ۾
اجان ڪجهه ڏينهن لڳندا
سنسار جا سيئي ڪک ۽ پن سَرو ۽ صنوبر
وسارڻ ۾ اجان ڪجهه ڏينهن لڳندا
ٿڪل هارائيل خوابن جي ساحل تي،
ڪٿي، اميد جو هڪڙو ننڍڙو گهر
ٺهندي ٺهندي رهجي ويو آهي
اهو هڪڙو گهر وسارڻ ۾ اجان ڪجهه ڏينهن لڳندا
پر هاڻي ڏينهن ئي ڪيترا رهيا آهن
بس هڪ ڏينهن دل جي اوسيئڙي واري گهر تي
او چيتو
رات لهندي
منهنجي بي نور اکين جي خزاني ۾ لڪيل هر خواب
جي تڪميل ٿيندي
مون کي به خواب ۾ تبديل ڪندي
هڪڙو اهڙو خواب جي کي ڏسڻ ممڪن نه هو
هڪڙو اهڙو خواب جنهن جي ليڙون ٿيل دامن ۾ ڪو
مبارڪ، ڪو روشن ڏينهن نه هو
اجان ڪجهه ڏينهن لڳندا...

(امرتا -مترجم سعيده دراني)

بارھواں کھلاڑی

خوش گوار موسم میں
اَن گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے
بارھویں کھلاڑی کو
ہوٹ کرتا رہتا ہوں
بارھواں کھلاڑی بھی
کیا عجب کھلاڑی ہے

کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
اِنتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا

جس میں سانحہ ہوجائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملۂ خوش کن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام پر ہوجائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہوجائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل سے کھلاڑی کا

عمر بھر کا رشتہ ہے
عمر بھر کا یہ رشتہ
چھوٹ بھی تو سکتا ہے
آخری وِسل کے ساتھ
ڈوب جانے والا دِل
ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
تم بھی اِفتخار عارف
بارھویں کھلاڑی ہو
انتظار کرتے ہو

ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جس میں حادثہ ہو جائے
جس میں سانحہ ہو جائے
تم بھی اِفتخار عارف
تم بھی ڈوب جاؤ گے
تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

ٻارهون رانديگر

خوشگوار موسم ۾

اڻ ڳڻت تماشائي

پنهنجي پنهنجي ٽيمن کي

داد ڏيڻ لاءِ ايندا آهن

پنهنجن پنهنجن پيارن جو

حوصلو وڌائيندا آهن

مان الڳ ٿلڳ سڀ کان

ٻارهن رانديگر کي

هوٽ ڪندو رهندو آهيان

ٻارهون رانديگر به

ڇا عجب رانديگر آهي

راند هلندي رهندي آهي

گوڙ ٿيندو رهندو آهي

داد ملندي رهندي آهي

۽ هو الڳ سيئن کان

انتظار ڪندو آهي

هڪ اهڙي ساعت جو

هڪ اهڙي لحظي جو

جنهن ۾ سانحو ٿي وڃي

پوءِ هو ڪيڏانهن لاءِ نڪري

تارن جي جهرمٽ ۾

هڪ جملو سرهائي جو

هڪ نعرو ساراهه جو

هن جي نائون تي لڳي

سيني رانديگرن سان گڏ

هو به مان وارو ٿي وڃي

پر اهو گهٽ ئي ٿيندو آهي

پوءِ به ماڻهو چوندا آهن

راند سان راندیگر جو

عمر ڀر جو رشتو آهي

عمر ڀر جو هي رشتو

ڇُٽي به نه سگهي ٿو

ٽُٽي به نه سگهي ٿو

تون به افتخار عارف

ٻارهون راندیگر آهين

انتظار ڪندو آهين

هڪ اهڙي لحظي جو

هڪ اهڙي ساعت جو

جنهن ۾ حادثو ٿي وڃي

جنهن ۾ سانحو ٿي وڃي

تون بہ افتخار عارف

تون بہ بڈي ويندي

تون بہ تتي ويندي

(امرتا ـمترجم سعيده دراني)

گم نام سپاہی کی قبر پر

سپاہی! آج بھی کوئی نہیں آیا
کسی نے پھول ہی بھیجے
نہ بستی کے گھروں سے آشنا گیتوں کی آوازیں سنائی دیں
نہ پرچم کوئی لہرایا
سپاہی! شام ہونے آئی اور کوئی نہیں آیا
فنا کی خندقوں کو جان دے کر پار کر جانا بڑی بات
جہاں جینے کی خاطر مر رہے ہوں لوگ، اُس بستی میں مر جانا بڑی بات
مگر پل بھر کو یہ سوچا تو ہوتا
تمھارے بعد گھر کی منتظر دہلیز کو جاگے ہوئے دل کی نشانی کون دے گا
ہواؤں سے اُلجھتی، روشنی کو اعتبارِ کامرانی کون دے گا
در و دیوار سے لپٹی ہوئی بیلوں کو پانی کون دے گا!؟

گمنام سپاهيءَ جي قبر تي

سپاهي ! اڄ بہ ڪوئي نہ آيو
نہ ڪنهن گُل ئي موڪليا
نہ وسنديءَ جي گهرن مان چاتل سجاتل گيتن جا آواز ٻڌڻ ۾ آيا
نہ ڪوئي جهنڊو جهوليو
سپاهي ! شام ٿيڻ واري آهي ڪوئي نہ آيو
فنا جي ڪاهين کي جان ڏئي پار لنگهڻ وڏي ڳالهہ آهي
جتي جيئڻ جي خاطر ماڻهو مري رهيا آهن،
اُنَ وسنديءَ ۾ مري وڃڻ وڏي ڳالهہ
پر گهڙيءَ پلڪ لاءِ اهو بہ تہ سوچين ها
تو کان پوءِ گهرن جي منتظر چائنٺ کي
سجاڳ ٿيل دل جي نشاني ڪير ڏيندو
هوائن سان وچڙندڙ روشنيءَ کي ويساهہ جي سوڀ ڪير ڏيندو؟
درن ۽ پٽين سان چنبڙيل وَلين کي پاڻي ڪير ڏيندو ! ؟

(امرتا ـ مترجم سعيده دراني)

ایک نابینا بستی کے نام

بستی کی سب گلیوں اور بازاروں اور چوباروں میں
ایک نعرہ گونج رہا ہے
''سورج کو رہا کرو''
''سورج کو رہا کرو''
سورج کی آزادی مانگنے والے کیا بالکل اندھے ہیں!

به نام شهری کور

در همه کوچه ها ،خیابانها،بازار ها وچهار راه های شهر
شعاری،نعره ای و خروشی
طنین انداز است
ما آزادی خورشید را می خواهیم،
"خورشید را آزاد کنید"
کسانی که خواستار آزادی خورشید ند
آیا همه کورند؟

مترجم:ڈاکٹر انجم حمید،شهلا شهسوندی

تجاہلِ عارفانہ

جوہری کو کیا معلوم کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں
کیسی باس ہوتی ہے
جوہری کو کیا معلوم
جوہری تو ساری عمر پتھروں میں رہتا ہے
زرگروں میں رہتا ہے
جوہری کو کیا معلوم
یہ تو بس وہی جانے
جس نے اپنی مٹی سے
اپنا ایک اِک پیماں
استوار رکھا ہو
جس نے حرفِ پیماں کا اعتبار رکھا ہو
جوہری کو کیا معلوم کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے

تجاهل عارفانه

جواهر فروش خبر ندارد که در کدام خاك
چه نوع گلی شگفته می شود
و کدامین گل
چه نع بوی خوش به مشام می رسد
جواهر فروش چه مه داند
که عمر خوش در کنار سنگ های گرنبها سپری می سازد
و درمیان جواهر فروشان مانند خود
نفس می کشد
جواهر فروش چه می داند و کجا خبر دارد

مترجم:ڈاکٹر انجم حمید،شهلا شهسوندی

بحضور سید الشہداؑ

شرف کے شہر میں ہر بام و دَر حسینؑ کا ہے
زمانے بھر کے گھرانوں میں گھر حسینؑ کا ہے

فراتِ وقتِ رواں ! دیکھ سُوئے مقتل دیکھ
جو سربلند ہے اب بھی وہ سر حسینؑ کا ہے

زمین کھا گئی کیا کیا بلندوبالا درخت
ہرا بھرا ہے جو اب بھی شجر حسینؑ کا ہے

سوالِ بیعتِ شمشیر پر جواز بہت
مگر جواب وہی معتبر حسینؑ کا ہے

کہاں کی جنگ کہاں جا کے سَر ہوئی ہے کہ اب
تمام عالمِ خیر و خبر حسینؑ کا ہے

محبتوں کے حوالوں میں ذکر آنے لگا
یہ فضل بھی تو مرے حال پر حسینؑ کا ہے

حضور شافعِ محشرؐ ، علیؑ کہیں کہ یہ شخص
گناہ گار بہت ہے مگر حسینؑ کا ہے

به محضر سید الشهدا(ع)

در بلاد شرف هر بام ودر
شرف حسین است
درمان خانواده های جهان
خانواده حسین است
فرات زمان روان ،ببین سوی مقتل ببین
کسی که تاکنون سربلند است
سرِ حسین است
بلعید زمین ، چه درختان بلند و بالا را
شجری که ناکنون سبز است ،
شجر حسین است
بر سر سوال بیعت شمشیر ،دلیل فراوان است
اما پاسخ معتبر
پاسخ حسین است
جنگ کجایی به کجا انجامید که اینک
سراسر عام خیر و خبر
خیر وخبر حسین است
در ضمن که بر حالم شد
لطف حسین است
به حضور شافع محشر ،علی(ع) گوید که این شخص
از بس گنهکار است ،اما
وبسته حسین است

مترجم:ڈاکٹر انجم حمید،شهلا شهسوندی

نظمت چہ فسوں خواند......

افتخار عارف کی شاعری...... ناقدین کی نظر میں

سلیم احمد

''افتخار عارف میرے لیے انتظار کا نام ہے۔ ایک شاعر کا انتظار جسے میں پورے آدمیوں کی فہرست میں رکھ سکوں۔ اپنی نسل کے شعرا میں وہ سب سے سنجیدہ شاعر ہیں اور اپنے مواد اور فن دونوں میں ایک ایسی پختگی کا اظہار کرتے ہیں، جو دوسروں میں نایاب نہیں، تو کمیاب ضرور ہے۔ افتخار عارف کی شاعری ایک ایسے شخص کی شاعری ہے، جو سوچنا، محسوس کرنا اور بولنا جانتا ہے، جب کہ اس کے ہم عصروں میں بیشتر کا المیہ یہ ہے کہ یا تو وہ سوچ نہیں سکتے، یا وہ محسوس نہیں کر سکتے اور سوچ اور احساس سے کام لے سکتے ہیں، تو بولنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ ان کی ان خصوصیات کی بنا پر جب میں ان کے کلام کو دیکھتا ہوں، تو یہ احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ افتخار عارف کی آواز جدید اردو شاعری کی ایک بہت زندہ آواز ہے۔ ایک ایسی آواز جو ہمارے دل و دماغ دونوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ہمیں ایک ایسی آسودگی بخشتی ہے، جو عارف کے سوا شاید ہی کسی اور شاعر میں مل سکے۔''

کیفی اعظمی

''افتخار عارف کا فن مجھے بہ حیثیتِ مجموعی پسند ہے، لیکن سب سے زیادہ جس خوبی نے مجھے ان کا گرویدہ بنایا وہ افتخار کا کھرا لہجہ ہے۔ پچھلے چند برسوں میں ہمارے درمیانی طبقے کے نقادوں نے

جو طرح طرح کی اعصابی بیماریوں کا شکار ہیں، ترقی پسند شاعروں کے لہجے کی صلاحیت اور گھن گرج کے خلاف اتنا شور مچایا کہ بہت سے نوجوانوں نے اپنے لہجے کے بانکپن کو ایک طرح کی انفعالیت اور نسائیت سے بدل لیا۔ افتخار عارف نے ہر حالت میں اپنے لہجے کے بانکپن کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ ان کے احساس کی شدت، جذبے کے خلوص اور شعور کی حدت نے اس پر نئی دھار رکھ دی ہے۔''

مشفق خواجہ

''افتخار عارف نے اپنے شعری ہنر کو جذبہ و فہم کی اس اکائی کے طور پر برتا ہے، جو نفس و آفاق کی حقیقتوں اور گہرائیوں کے ادراک سے مرتب ہوتی ہے اور فکر و نظر کے وسیع تر دائرے قائم کرتی ہے۔ ان کے لہجے کا اعتماد اور آواز کا استحکام بھی ان کی انفرادیت کی دلیل ہے۔ وہ ان جدید شاعروں میں سے ہیں، جن سے شاعری کا اعتبار قائم ہوتا ہے۔ افتخار عارف کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ ایک ایسا اسلوب بنانے اور لحن پانے میں کامیاب رہے ہیں، جس میں شاعر کا احساسِ ذات اس کے گرد و پیش کی فضا سے بے نیاز نہیں ہوتا، بلکہ اس سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات اور ان کا عہد ایک دوسرے کی پہچان بن گئے ہیں۔ شاعری میں یہ منصب کبھی کبھی اور کسی کسی ہی کو حاصل ہوتا ہے۔''

فیض احمد فیض

''افتخار عارف کے کلام میں میر و غالب سے لے کر فراق و ارشد تک سبھی کی جھلکیاں موجود ہیں، لیکن آپ نے ان بزرگوں سے استفادہ کیا ہے، کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، بلکہ لے اور آہنگ کی طرح کچھ ایسا ہی اجتہاد: لغت اور محاورے میں بھی کیا ہے۔ موضوع کی رعایت سے کہیں کلاسیکی اور ادبی زبان کے شکوہ سے کام لیا ہے، تو کہیں روزمرہ کی بولی ٹھولی کو شعریت سے پیوند کیا ہے، حتیٰ کہ غزل جیسی کافر صنف میں بھی کچھ انفرادی برھت کی ہے۔ آج کل غزل سے جو دراز دستیاں کی جا رہی ہیں ان پر توجہ دینے کے بجائے غزل کے سبھی تلازمے برقرار رکھے ہیں،

لیکن نہ چلتی ہوئی بحروں کا سہارا لیا ہے، نہ روندی ہوئی زمینوں پر انحصار کیا ہے، نہ لفظی چٹخاروں سے داد وصول کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بدل میں کم مستعمل بحریں استعمال کی ہیں اور نفسِ مطالب کو قافیہ بند کرنے کے بجائے غیر متوقع اور برمحل سلیقے سے شعر کو جگمگا دیا ہے۔''

مشتاق احمد یوسفی

''افتخار عارف کے پہلے مجموعے مہرِ دو نیم اور حرفِ باریاب کے درمیان دس سال، ایک برِ اعظم، ہزاروں میل کی مسافتیں، ایک خوابِ نیم روز اور خود افتخار عارف حائل تھے۔ یہاں تک پہنچنے میں انھیں دنیا کا سب سے لمبا سفر طے کرنا پڑا، یعنی حصارِ ذات سے نکل کر زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے اور جو کچھ دیکھا ہے، وہ دوسروں کو دکھانے کی سعیِ مسلسل، جو فنی اظہار و ابلاغ کی اصل غایت ہے۔ ان کے لہجے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا اپنا اور منفرد اور پُر اعتماد لہجہ ہے۔ ان کے کینوس کے نئے رنگ، تازہ کاری اور موضوعاتی تنوع اس تجرباتی عمل کا ثمر ہیں، جس سے وہ ان دس برسوں میں اپنی کلاہ کج کیے گزرے ہیں۔''

بانو قدیسہ

افتخار عارف سے کسی ادبی محفل میں ملیں یا کسی ذاتی مجلس میں تو جو پہلی بات آپ کے مشاہدے میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ افتخار اپنی عینک اسی طرح استعمال کرتا ہے جیسے کوئی خوبصورت نروس لڑکی اپنے دوپٹے سے کج ادائیاں کرتی ہے۔

افتخار عارف کو بہادر بننے کا بہت شوق ہے وہ ایسے رویے سے چلتا ہے گویا فوج کا سپاہی ہو اور دشمن کا صفایا کرنے کے علاوہ اسے دنیا میں کوئی کام نہ ہو لیکن افتخار عارف بنیادی طور پر سپاہی نہیں تخلیق کار ہے اسے ہیرو سے بھی محبت ہے اور ولن کا نقطۂ نظر وہ خوب سمجھتا ہے اسی لیے بہادری کے لمحوں میں وہ جن لوگوں کا دل دکھا دیتا ہے، پھر ساری عمر انہیں منانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

ایک اچھے تخلیق کار کا بنیادی وصف تضاد ہوا کرتا ہے اس کے چاہنے والے اس کی خوبیوں کے گن گاتے رہتے ہیں اور اس کے نامنصف تنقید نگار اس کی ذات میں کیڑے ہی نکالتے رہتے ہیں۔ اعمال کی جانچ پڑتال کے لیے اللہ نے روز جزا مقرر کر رکھا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم سب روز اس جانچ پڑتال میں لگے رہتے ہیں اور دوسروں کو تولنے، پرکھنے اور ان پر رائے دینے میں خود اپنا ہی وقت ضائع کرتے ہیں۔ کیا کیا جائے یہ بھی انسانی فطرت کا بنیادی وصف ہوگا ورنہ اس قدر شغلی میٹنگ کی ہم سب کو عادت نہ ہوتی۔

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

افتخار عارف شائستگی اور تہذیب کا حامل ایسا خوب سیرت اور خوب صورت شخص ہے جس کے علمی، ادبی اور انتظامی کمالات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ایسا صاحبِ مطالعہ، جس کا کسی سے موازنہ ہو نہیں سکتا۔ ایسا عالم جو جدید و قدیم علوم سے یکساں طور پر آگاہ ہے۔ افتخار عارف پاکستانی تہذیب کا جاندار بہت عمدہ ہے اور بڑوں کی تعظیم ان کے مزاج کی روح ہے۔ گفتگو کا اسلوب بھی بس اسی کا خاصا ہے جو نہ کہیں دیکھا نہ سُنا! افتخار عارف اردو شاعری میں تازہ کار اور اردو ادب کا افتخار ہے۔ اللہ سلامت رکھے اور مزید کامیابی سے سرفراز کرے۔

اختر الایمان

"عصرِ جدید کے شاعروں میں جو نام بہت اُبھر کر سامنے آئے ہیں، ان میں افتخار عارف کا نام سرِفہرست ہے۔ ان کی شاعری عصری ہونے کے ساتھ کلاسیکی روایت سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ اس عہد کے بعض لکھنے والوں کو پڑھ کر ان پر فارسی یا عربی شاعر کا دھوکا ہوتا ہے، مگر افتخار عارف کو پڑھ کر افتخار ہی ذہن میں آتے ہیں، کوئی دوسرا شاعر نہیں۔ انھیں اردو شاعری کا خوش آئند مستقبل کہا جا سکتا ہے۔ خدا ان کی عمر دراز کرے۔"

زیتون بانو

افتخار عارف ادبی دنیا کا وہ معتبر نام ہے جن کی شاعری کا ایک عالم گرویدہ تو ہے ہی مگر نئی نسل کے لیے ان کی سوچیں ایک رول ماڈل کی حیثیت اختیار کر گئیں ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ نئی نسل کے کئی قاری کو ان کی اکثر غزلیں اور بطور خاص ان نظمیں ازبر ہیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین کے زمانے میں انہوں نے ملک کی ہر بولی جانے والی زبان کے شعراء وادباء کو ایک دوسرے کے نزدیک آنے کے مواقع فراہم کیے۔

ادبی اور شعری حلقے افتخار عارف کی ان تمام کوششوں کو فراموش کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکیں گے کہ یہ سب کچھ سچ اور حقیقت پر مبنی ہے کہ اس کے پیچھے ان کی ادب اور ادیب کی سچی لگن اور قلم سے نکلے ہوئے حرف کی حرمت کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔

انتظار حسین

''انیس کے بعد ہماری عقیدتی شاعری کی روایت میں ایک اور واقعہ گزر گیا۔ وہ واقعہ ہے اقبال کا ظہور۔ اقبال نے انیس کے شعری بیان سے گزر کر واقعۂ کربلا کو ایک اور سطح پر سجا کر علامتی رنگ میں برتا اور اس کا رشتہ ہمارے زمانے کے ساتھ قائم کر دیا، تو اب انیس اور افتخار عارف کے درمیان اقبال حائل ہے اور جب ایک بڑا شاعر اسی میدان میں ظاہر ہو جائے، جس میں ایک بڑا شاعر گزر چکا ہو، تو پھر وہ کسی بعد میں آنے والے باشعور شاعر کو پچھلے کی طرف جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اب اگر آج کا کوئی شاعر اقبال سے کنی کاٹ کر انیس سے رجوع کرتا ہے، تو پھر وہ مجلسوں میں پڑھا جانے والا مرثیہ لکھے گا اور امام بارگاہ سے باہر نہیں آ سکے گا۔ افتخار عارف کی عقیدتی شاعری نے انیس کو ہضم کرنے کے بعد اس شعور سے رشتہ جوڑا ہے، جس نے اقبال کی عقیدتی شاعری کے ساتھ ظہور کیا تھا۔ سو وہ ہمارے زمانے کی صورتِ حال کے ساتھ بھی پیوست ہے اور جو انھوں نے سیکولر روایت میں شاعری کی ہے، اس کے ساتھ بھی ہم رشتہ ہے۔''

آفتاب اقبال شمیم

افتخار عارف نے اپنی علمی زندگی میں پیش آنے والے دل اور دنیا کے تضادات کو اپنے اندر موجود غم کی معرفت سے جانا ہے۔ اسے یہ داخلی غم شاید مذہب وعقیدہ سے گہری وابستگی اور شاعری کے ساتھ عمر بھر کی کومٹ منٹ نے عطا کیا ہے، وہ دل اور دنیا کے درمیانی فاصلوں کا مساحت گر بھی ہے اور اسی تجربے نے اس کے اندر ایک خوئے تسلیم پیدا کی ہے جو شعر میں اتر کر علاج بالمثل کا کام کرتی ہے اور ان تضادات کر معتدل بنا دیتی ہے کارِ دنیا میں دل کے زیاں کا احساس اور اعتراف ہمیں باور کراتا ہے کہ یہ شاعری سچ بولتی ہے۔ پائے کی شاعری کا یہی منصب بھی ہے۔ اس ضمن میں عجز اور پندار کے دوگونہ امتزاج سے تخلیق پانے والے شعر سیدھے دل میں اُتر جاتے ہیں۔

افتخار عارف ایک ایسا شاعر ہے جو ہمیں واقعہ دیکھنے اور اپنے عہد سے مکالمہ کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اس کے لیے کیۂ یقین میں گرےڈ بے اختیار کی دولت کافی نہیں بلکہ اس دور کے ''جہانِ معلوم'' کے پورا ادراک اور عصری شعور کا ہونا بھی لازم ہے۔ اس اعتبار سے وہ ایک جدید شاعر ہے اور اس کے ہاں آزاد خیالی، ترقی پسندی، کا رویہ، احتجاج و مزاحمت اور عصری حساسیت کے عناصر بہت نمایاں ہیں۔

افتخار عارف کے لہجے میں سادہ کاری، گداز، بات کرنے میں توقف اور ذرا سے مختلف انداز میں بات کہنے کا سلیقہ، اس کے اسلوب کو پُر اثر اور منفرد بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

''افتخار عارف کی شاعری کا بنیادی موضوع رزقِ جلیل ہے۔ یہی رزقِ جلیل قربتِ خسروانہ میں بھی ہمیں مرنے نہیں دیتا، بلکہ حیاتِ ابدی کا سراغ دیتا ہے۔ یہی رزقِ جلیل اور نانِ جویں ہمیں اس مستقر تک پہنچاتی ہے، جسے گھر کے علاوہ کسی دوسرے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ افتخار عارف کی شاعری کا موضوع رزقِ حلال اور وہ گوشۂ عافیت ہے، جو مکان کو گھر بناتا ہے اور ان دونوں

کا حصول ہمیشہ اس منزل تک پہنچاتا ہے کہ موت ہمارے جسم کو چھوتی ہے، مگر ہمارے وجود کے مرکز سے دور رہتی ہے۔

غزل کے رموز و علائم شاعری کو 'بیان' بننے نہیں دیتے اور شعر اپنے مرتبۂ عالی سے نیچے نہیں اُترتا۔ افتخار عارف کی علامتوں میں ان کے موضوعات کو سمیٹنے کی قوت موجود ہے۔ علیؑ کی علامت کے مرکزیہ کے گرد اور کئی دائرے موجود ہیں۔ حسینؑ، کربلا، فرات، صبر، استقامت۔ کربلا ایک گزرا ہوا واقعہ نہیں، بلکہ زندگی کا ایک مرحلہ مستقل ہے۔ کربلا اس قطرۂ خون کا نام ہے، جو ہمیں مقتل تک لے جاتا ہے اور بار ہا۔ سید سلیمان ندوی یاد آ گئے:

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

غزل گو شاعر کا کمال اور فن یہی ہے کہ وہ اپنے بنیادی خیالات و فکر کو جذبہ بنا دیتا ہے۔ جذبے کا یہی رنگ و آہنگ شعر کو فلسفے سے الگ اور ممتاز کرتا ہے کہ مجرد خیالات انسانی زندگی کی ہمہ گیری، گرمی اور گیرائی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اسی ہمہ گیری نے افتخار عارف کے اس شعر کو ضرب المثل کے درجے پر فائز کر دیا ہے:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کو گھر کر دے

کسی معاشرے کے عام عقائد اور تصورات کو شعر کے وسیلے سے ضرب المثل بنا دینا ایک آسان بات ہے۔ ذوق نے اسی بات کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا، مگر افتخار عارف نے اپنے فکر کو یہ عمومیت عطا کر کے سخن وری کا حق ادا کیا ہے۔

افتخار عارف نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندازِ زیست کو اپنی غزل میں انسانی صورتِ حال بنا دیا ہے۔ ہم نے ادیبوں اور مشائخ کے اجتماعات میں بیشتر ہاتھوں کو کاسۂ طلب میں بدلتے دیکھا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو، تو کہاں کی غیرت اور کہاں کی عزتِ نفس:

ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دستِ کرم
کہ سارا شہر لیے کاسۂ طلب نکلا

اور انھی مناظرِ امروز میں کربلا کا استعارہ صداقتِ امروز بن کر اُبھرتا ہے:

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے''

ڈاکٹر عنایت اللہ فیضیؔ

افتخار عارف کو میں نے ٹیلی وژن پروگراموں میں جتنا پسند کیا تھا۔ ملاقات پر وہ مجھے میرے اندازے سے بڑھ کر پیاری شخصیت کے روپ میں نظر آئے۔ غزل گوئی میں افتخار عارف کا اسلوب جون ایلیا کی طرح سہل ممتنع کی صنعت کے قریب تر ہے انہوں نے انسانی دکھوں کو بھی رومانوی طرزِ بیان میں سمو دیا ہے۔ مراثی، منقبت اور حمد و نعت میں ان کے لہجے کی عقیدت بھری چاشنی بے حد دلپذیر ہے تحت اللفظ میں ان کا انداز عصرِ حاضر میں بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آیا ہے۔ ایسی قد آور شخصیات صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

''کسی بھی اُبھرتے ہوئے شاعر کو سب سے بڑا خطرہ اپنے عہد کی مانوس آوازوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے عہد کی آوازوں میں میرا جی، راشد، جوش، یگانہ، فراق اور فیض کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ یگانہ کا اثر محدود ہے اور جوش کا اثر ان کی زندگی ہی میں فنا ہو گیا۔ البتہ دوسروں کے فیوض و برکات جاری ہیں۔ افتخار عارف اپنے رومانی مزاج اور احتجاجی حوالے سے فیض کے سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لگتا ہے انھیں اس کا احساس بھی ہے کہ ان کی طرزِ گفتار کو سب سے بڑا خطرہ فیض سے لاحق ہے، کیوں کہ فیض کی رومانی اور انقلابی شاعری نے اس نوعیت کے اسلوب کے امکانات کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اب جو بھی آئے گا یا تو وادیٔ تقلید میں گلگشت فرمائے گا، یا

بہت عزت ملی، تو بے مزہ شاعری کے دربارِ عام سے خلعت فاخرہ پائے گا۔ حسن ومحبت اور انقلاب وانحراف ابدی موضوعات ہیں، لیکن شعری اختصاص وامتیاز کی راہیں فکر واظہار کی تازہ کارانہ پیرایوں ہی سے نکل سکتی ہیں۔ افتخار عارف کو اس کا پورا احساس ہے۔ انھوں نے کلاسیکی روایت سے خوش سلیقگی کی روشنی لی ہے اور اسے غیر رسمی بے تکلف تازہ لہجے سے پیوند کیا ہے۔ اس میں کچھ ہاتھ اُودھی کے تخلیقی ربط کا بھی ہے، جو ابتدائی عمر کی دین ہو سکتا ہے۔ ان کی آواز میں نرمی، رس اور لوچ ہے، جو اودھی کی گھلاوٹ اور زمینی پن کی راہ سے آیا ہے۔ کہیں کہیں طویل بحروں میں ارکان کی تعداد بڑھادی ہے۔ بعض جگہ آوازوں کو بڑھایا؛ گھٹایا ہے، جس سے ان کا لہجہ ہندی آہنگ کی داخلی موسیقی سے قریب تر آ گیا ہے۔ انسان سے ان کا لگاؤ اور محرومیوں سے پیدا ہونے والا دردِ محبت احتجاجی لے میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ ایک کیفیت سے کئی کیفیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ افتخار عارف غزلیں اور نظمیں دونوں لکھتے ہیں۔ دونوں پر انھیں یکساں قدرت حاصل ہے، لیکن غزل کے اشعار میں شدتِ احساس کہیں زیادہ ہے۔ ایسا شاید ان کے مخصوص تخلیقی مزاج کی وجہ سے ہے، یا ان رموز وعلائم کی وجہ سے، جنھیں ان کی شناخت قرار دیا جا سکتا ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی

''جب سے کتابِ دل و دنیا ہاتھ آئی ہے، طبیعت پر عجب سرشاری کا عالم ہے۔ کتاب کا نام بھی کتنا اچھا اور کتاب کا کام بھی کتنا اچھا۔ ہر چند کہ غزل اور نعت ومنقبت کے اکثر شعر پڑھے ہوئے تھے اور بہت سے ان میں سے یاد بھی تھے، لیکن یک جا دیکھ کر اور اتنے خوب صورت چھپے ہوئے دیکھ کر جی بھی خوش ہوا اور قندِ مکرر کا بھی لطف آیا۔ تمھارے شعروں میں یاد ہونے کی صلاحیت بدرجۂ اتم ہے اور تمھاری محزوں آواز میں چھپی ہوئی صلابت ان اشعار کو اور بھی بے نظیری عطا کرتی ہے۔ محزونی اس درجہ، خود احتسابی اس درجہ، ابنائے زماں کی بے مہری اور بے تہی کا احساس اس درجہ اور پھر بھی عدم انفعالیت اس درجہ۔ اسے بزرگوں کا فیض کہیں، یا اپنی وہبی قوت، یا خدائے بخشندہ کی عطا، بات وہی رہتی ہے کہ لفظوں کو جوڑنے کا کام، جسے آئے وہی سرسبز ہو۔

میرا خیال ہے اس وقت برِ صغیر میں کوئی شاعر (بلکہ نثر نگار بھی) تمھارے سوا ایسا نہیں ہے، جسے ہمارے ادبِ عالیہ کی لفظیات کا شعور اور عرفان اس درجہ ہو۔ اقبال، غالب، بیدل، میر انیس، میر درد، ان سب کا نچوڑ ہے، لیکن رنگ اپنا ہے۔ انفرادیت کی بھی وہ شان ہے، جسے طبیعت کی گل ایجادی کہیے، لیکن جس میں بناوٹ کہیں سے نہیں۔

میں نے کئی بار سوچا ہے کہ تم (نے) لہجے کی شیرینی اور آہنگ کی بلندی کا وہ امتزاج پیدا کیا ہے کہ جس کی مثال ڈھونڈنے کے لیے سوڈیڑھ سو برس، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ پیچھے جانا پڑے، لیکن مغنی تم ہمارے زمانے کے ہو اور خدا نے تمھیں مقبولیت بھی ویسی ہی عطا کی ہے۔

تمھاری نظموں میں غزل کی صفت جگہ جگہ در آئی ہے اور ہر چند کہ نظمیں بھی جدید لہجے کا پورا اعتبار قائم رکھتی ہیں، لیکن ان میں معنی (کی) وہ فراوانی نہیں، جسے تمھاری غزل (کا) طرۂ امتیاز کہا جانا چاہیے۔''

شبنم شکیل

اس میں کوئی شک نہیں کہ قدرت نے افتخار عارف کو نوازنے میں بہت فیاضی سے کام لیا ہے۔ بہت سی صفات نے یکجا ہو کر ان کی شخصیت میں ایک عجب طرح کا سحر پیدا کر دیا ہے۔ شعر کے حوالے سے شہرت، مقبولیت اور عزت کے دروازے تو ان پر نوجوانی ہی میں وا ہو گئے تھے۔ مگر قدرت نے اس پر اکتفا نہیں کیا اس کے ساتھ انہیں بلا کا حافظہ بھی بخش دیا۔ گفتگو کا سلیقہ بھی، بہت ہی لطیف اور عصیر الفہم (Subtle) اور شائستہ قسم کی حسِ مزاح بھی۔ محفل کے ادب آداب، رکھ رکھاؤ اور رشتوں کے تقدس کے حوالے سے آپ کو افتخار جیسے لوگ اس معاشرے میں اب خال خال نظر آئیں گے۔ اپنی مٹی اور اپنی ثقافت سے محبت کرنے والے اس شخص کا ایک اور حوالہ بھی بہت ممتاز ہے اور وہ ان کی علمیت کا حوالہ ہے۔ عالم کی اصطلاح برتنے کے معاملے میں ہم لوگ خاصے فیاض واقع ہوئے ہیں۔ لیکن افتخار اس اصطلاح کے اطلاق کے لیے موزوں ترین شخص ہیں۔ انہوں نے دنیا کی بہت سی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا ہے اور یوں اس گہرے مطالعے

نے ان کے اندر ایک کشادہ نظری پیدا کر دی ہے۔ قلب و ذہن کی یہ کشادگی مذہب کے حوالے سے بھی ان کے مکتبہ فکر میں کارفرما نظر آتی ہے۔

دوستی کے معاملے میں افتخار آؤٹ آف دی وے جانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ وہ دوستوں کے برے بھلے وقت میں انہیں تسلی اور تشفی بھی دیتے ہیں اور مشورے بھی۔ اسی قسم کی توقع وہ دوسروں سے بھی رکھتے ہیں اور جب دوست ان کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے تو انہیں بہت افسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غصہ بھی آتا ہے۔ بعض اوقات وہ ایسے موقعوں پر بہت شدید قسم کے جذباتی ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی شخصیت کے اس ایک منفی پہلو نے انہیں بہت سے مخلص لوگوں سے دور بھی کر دیا ہے، مگر کیا کیا جائے کہ ہمہ وقت ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار رہنے والا اور خود سے ہردم برسرِ پیکار رہنے کو تیار شخص اگر کچھ موقعوں پر اس قسم کے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔

میں نے انہیں اس وقت بھی دیکھا ہے جب مکمل طور پر اپنے آپ سے مطمئن اور حلم جوئی کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ تب ان کی شگفتگی طبع دید کے قابل ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو ان کے تمام غم اور تمام خوشیاں شدتِ احساس کی دین ہیں۔ زندگی کی سختیاں گو انہوں نے اوائلِ عمری ہی سے جھیلنا سیکھ لی تھیں اور ان میں اپنی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا ہنر بھی آ گیا تھا۔ مگر میں خوب جانتی ہوں کہ اتنے احساس شخص پر جب ''گزری ہوئی کچھ تلخیاں'' اور ''بیتے ہوئے دن رنج کے''، ''شب تنہائی میں شمع بن کر''، ''دلِ صد چاک پر روشنی ڈالتے ہیں'' تو خود پر کیا گزرتی ہوگی۔

م۔ ر۔ شفق

افتخار عارف صاحب کا شمار، جدید اُردو ادب کے ان دانشوروں میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے شعر و سخن کے حوالے سے شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں مقام پایا ہے۔ شاعر و دانشور ک ی حیثیت سے، افتخار عارف کی مقبولیت، وطنِ عزیز تک محدود نہیں، سات سمندر پار بھی ان کے فکر و فن کو پذیرائی ملی ہے۔

آپ نرم لہجے میں گفتگو کرتے ہیں لیکن جب کسی علمی ادبی موضوع پر اظہار خیال فرماتے ہیں تو آپ کے دلائل ٹھوس، معلومات، فکروفن اور حوالے مستند ہوتے ہیں۔ لکھنو کی گود میں پرورش پائی ہے، خوش کلامی ان کا طرۂ امتیاز ہے، فصاحب و بلاغت ان کی بلائیں لیتی ہیں۔ تہذیب و شائستگی۔ وضعداری اور سلیقہ شعاری افتخار عارف کی شخصیت اورفن کے رخشندہ پہلو ہیں۔ اکابرین ادب اور معماران ادب سے ان کی روحانی اور ذہنی وابستگی خلوص پر مبنی ہے۔ خانوادۂ رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلعم سے الفت وعقیدت، حُبِ علی کرم اللہ وجہہ، وفائے حسنؓ، ایثار حسینؓ اور شہدائے کربلا کی عزیمت و استقلال کی نسبت سے بھی، انھوں نے جدید اُردو شاعری کو نئی جہتیں بخشی ہیں، جوافتخار عارف کے تعارف کا، ایک خاص حوالہ ہے۔

ان کے بعض اشعار تو زبان زدِ عام ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے تعلق سے بطور چیئرمین، اُردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ، اُنھوں نے پشتو سمیت دیگر پاکستانی زبانوں، ملک بھر کے نمائندہ شاعروں اور دانشوروں کو عزت واحترام دیا ہے اور اسی طرح وہ قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کو فروغ دینے کا عملی مظاہرہ کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں خوشحالی زندگی اور صحت کی دولت سے مالا مال رکھے۔ (آمین)

کشور ناھید

ہم نے اپنی ادبی زندگی میں لکھنوی تہذیب کے دو رنگ سنے ہوئے ہیں۔ ایک تو پہلے آپ پہلے آپ والا۔ اور دوسرے وہ تہذیب جو امراء جان کے حوالے سے ہم تک پہنچی۔ تجربے میں یہ آیا کہ لکھنو کا رکشہ ڈرائیور بھی آپ سے پوچھے کا '' آپ کہاں تشریف لے جائیے گا۔

بس یہی تہذیب ادب و آداب لیے افتخار عارف کراچی وارد ہوئے۔ چونکہ ہندی اور وہ بھی شدھ ہندی میں مہارت ایسی تھی کہ آج بھی مہابھارت کے اقتباسات فرفر سنا سکتے ہیں۔ اس لیے ریڈیو پاکستان کراچی میں خبریں پڑھنے سے پاکستان میں پڑاؤ کا آغاز

کیا۔ ہنر آوری اور عقلمندی کو دونوں ہاتھوں میں بطور مشعل لے کر روانہ ہوئے تو ٹیلیویژن کراچی سنٹر کے دروازے کھلتے چلے گئے اور کسوٹی پروگرام نے تو شہرت کو وہ چار چاند لگائے کہ آج بھی کوئی بزرگ راستے میں ملے تو وہ کسوٹی کے گن گاتا ہوا نہیں تھکتا ہے۔

ذہانت اور یادداسٹ کی آمیزش سے افتخار عارف نے پہچان کی پہلی منزل کسوٹی کے ذریعہ طے کر لی۔

ذاتی زندگی میں بہت فقیری کا سا طریق ہے۔ گفتگو اور یادداشت میں نظیر نہیں ملتی۔ دریا بھی ان کے آگے پانی بھرتا ہے۔ محبتوں میں سیماب پاتھ۔ پہلے ایک در کے نہ تھے مگر اب وہ دروازہ، گویا درگاہ ہو گیا جبین نیاز وہیں خم ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ لکھنوی آداب میں خوشامد شامل ہے تو گاہے گاہے اس کی رمق نظر آتی ہے۔ میرے ہمسائے ہونے کے ناطے میرے بہت سے مسائل کو وہ اپنے مسائل سمجھ کر حل کر بھی نہ سکیں تو کم از کم حرفِ تسلی تو عطا کرتے ہیں۔ اس رفاقت میں، رقابت کا زہر شامل نہیں ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک

افتخار عارف انحراف کے زمانے میں اثبات کا شاعر ہے۔ جس زمانے میں مسلمانوں کی ادبی اور فکری روایت سے بے رُخی سکہ رائج الوقت تھا عین اس زمانے میں افتخار عارف نے ہماری اپنی ادبی اور فکری روایت کی تردید کے چلن سے بغاوت کر کے مسلمانوں کی انسان دوست، روشن خیال اور ترقی پسند ادبی وفکری روایت کے تخلیقی اثبات کو رویہ اپنایا۔ میں افتخار عارف کے اس فنی نقطہ نظر کو تاریخی اور تخلیقی ہر دو اعتبار سے ایک کارنامہ خاص قرار دیتا ہوں۔

ڈاکٹر طیب منیر

کتابِ دل و دنیا میں سب باب شاعری کی فتح مندیوں کی طرف کھلتے ہیں۔ چوں کہ غزل کئی سو سال سے ہماری ادبی تاریخ اور تہذیب کی معروف اور ہر دل عزیز صنفِ سخن رہی ہے، اس

لیے افتخار عارف کی غزل کو زیادہ توجہ سے سنا اور پڑھا گیا ہے۔ غزلیات میں روایت سے ہٹ کر بہت کچھ ہے، نئی باتیں، نئے لہجے میں بیان کی گئی ہے۔ غزلوں میں شاعر نے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ردیف وقوافی کو نہایت عمدہ اور پُر تاثیر وسیلہ بنایا ہے۔ الفاظ و علائم سے گہری واقفیت اور ان کے درمیان گزر بسر نے شاعر کو یہ نعمت اور مہارت بھی عطا کر دی ہے کہ وہ دو مصرعوں کے درمیان بھی کوئی اور بات کہنے پر قدرت رکھتا ہے۔

مبین مرزا

گرڈ جیف نے اپنے نفسیاتی ضابطے میں اس نقطے کو اُبھارا ہے کہ شاعر (فن کار) کے اندر کسی نہ کسی درجے کا ایک صوفی بھی ہوتا ہے۔ ایلیٹ نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک بات کہی ہے، یہ کہ معنی خیز شاعری کے لیے صرف نیکی اور رحم دلی کے احساس اور جذبے کی فراوانی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے آدمی میں ذہنی اور روحانی صلاحیتیں بھی ہونی چاہییں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شاعر کے نصاب میں وظیفے پڑھنا اور چلے کاٹنا شامل ہونا چاہیے تاکہ وہ روحانی منزلیں طے کر سکے اور وجودی تقاضوں سے اور مادّی ضرورتوں سے مبرا ہو سکے، نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اُسے زندگی کے تجربے کو دیکھتے اور اُس پر سوچتے ہوئے اپنے اندر ایک ایسا دریچہ کھولنے کا ہنر بھی آنا چاہیے جو physical reality سے آگے non physical reality کا منظر دکھاتا ہے۔ یہاں وجود کا شعور بھی تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کی معنویت بھی۔ اب انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہوتی ہے اور خدا اور کائنات سے اپنے رشتے کی نوعیت بھی۔ یہ انسان کو اُس کے قدری تناسبات سے جاننے اور زندگی کو اس کے غیر مادّی حقائق کے ذریعے سمجھنے کا عمل ہے۔ انقلاب در انقلاب برپا کرتے ہوئے برق آسا تغیرات کے اِس دور میں تہذیبی عناصر اور انسانی اقدار کا جس طرح ملیامیٹ ہوتا چلا گیا ہے اُس نے آج کے شاعر کو یہ بات تقریباً بھلا دی ہے کہ جذبے اور تعقل کے زور پر بھی کچھ نہ کچھ اچھے شعر تو بے شک نکالے جا سکتے ہیں لیکن وہ اپنی بلند ترین سطح پر بھی اُس معنویت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے جو انسانی روح کے کسی داعیے کو سمجھنے یا

ورائے وجود حقیقت کو پانے سے روشن ہوتے ہیں۔

افتخار عارف کے یہاں احساس اور شعور کی یہ جو دو رَویں (جن کا ایک نام دل و دنیا بھی ہے) بہ یک وقت چلتی ہیں اور ظاہراً باہم درآویزاں خطوط کی طرح ایک دوسرے کو کاٹتی نظر آتی ہیں، دیکھنا چاہیے کہ اِن کی معنویت اُن کے شعری تجربے میں کیا بنتی ہے؟ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے وجود کے مختلف النوع تجربات اور متضاد مطالبات کو assimilate کر کے کُل میں ڈھالنے اور اُن سے احساس کا ضابطہ مرتب کرنے کا عمل ہے۔ یعنی یہ دونوں رویں ایک دوسرے کی سمت بڑھتی ہیں لیکن ایک دوسرے کو قطع نہیں کرتیں بلکہ متوازی خطوط کے طور پر ایک دوسرے کی تحدید کرتی ہیں اور ایک دوسرے کا رُخ متعین کرتی ہیں۔ ان دونوں میں اُس تصادم کی نسبت ہے جو نتیجتاً انہدام سے نئی تعمیر کا رُخ واضح کرتا ہے اور نفی سے اثبات کی صورت پیدا کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ چناں چہ فن کی سطح پر ان باہم درآویزاں لکیروں سے شاعر کے فکر و عمل یا احساس و شعور کی dichotomy عیاں نہیں ہوتی بلکہ یہ دونوں متضاد عناصر مل کر اپنی کلیت میں ایک بڑی اور زیادہ جامع سچائی کو پیش کرتی ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کو complement کرتی ہیں۔ یہ قطبین کے مابین وسیع و عریض منظر کو اُس کی حدوں کے پھیلاؤ میں دکھاتے ہوئے کشش کے دو الگ الگ مراکز کا سراغ بھی دیتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ کشش کے یہ دونوں مراکز کس قوت سے اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں اور شاعر کا ذہنی وجود ان دونوں قوتوں کے مابین کس طور سے توازن حاصل کرتا ہے اور پھر اپنی روحانی شناخت کے لیے ان دونوں میں سے کس کو اپنا مرکزِ ثقل بناتا ہے۔ اور یہی وہ تجربہ ہے جو ترقی پسند شاعری کے منظرنامے میں افتخار عارف کا نشانِ امتیاز بن جاتا ہے۔

نصیر مرزا

دورِ حاضر میں اردو زبان کے جو شعراء اپنے انفرادی اسلوب کی وجہ سے مشہور ہیں ان میں ایک افتخار عارف بھی ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے اپنے لیے نیا غمناک، دل آویز اور الگ تھلگ

Diction دریافت کیا ہے اس نے ان کو ہمعصر دنیا میں نمایاں مقام دیا ہے۔

شاعری کی شہرت سے پہلے افتخار عارف کو ہم نے پہلی دفعہ PTV کے پروگرام ''کسوٹی'' میں ایک اعلیٰ ذہین انسان کی حیثیت سے دیکھا تھا اور اسی پروگرام میں ان کی شائستہ گفتگو اور مہذب لہجے نے سب کو بے پناہ متاثر کیا۔ ان کے ساتھی عبید اللہ بیگ اور میزبان، قریش پور تھے۔ ان کے لیے مراد علی مرزا کہتے ہیں پاکستان میں ان جیسے ذہین انسان میں کم ہی دیکھے ہیں۔

(سندھی سے ترجمہ: ماہنامہ امرتا، حیدر آباد ۲۰۰۶)

ڈاکٹر شاہ محمد مری

شاعر، افتخار عارف انقلابیوں کے سٹڈی سرکل نصاب میں کبھی شامل نہ رہے۔ صرف فیض ہی ہمارے سلیبس کا حصہ تھے۔ افتخار عارف سیاسی جلسوں تحریکوں کے شاعر بھی نہ رہے کہ یہ میدان جالب کا رہا، یا، پانی (جالب) کی موت کے بعد تیمّم کے بطور احمد فراز کا۔ افتخار عارف برانڈڈ بننے کے اعزاز (یا دھبہ) سے بچے رہے۔

مگر انھوں نے کسی نہ کسی حوالے سے کربلا اور کربلا والے کے ساتھ وابستگی رکھی۔ اور اس استعارے کے مالک کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے سے وابستہ لوگوں کو سؤروں کے غوغا میں رہنے نہیں دیتے۔ وہ انھیں کھینچ دھکیل کر کسی نہ کسی صورت مظلوموں کے طرفداروں کی صف میں لا شامل کر دیتے ہیں۔ .... سب سے آگے کی صف میں، درمیان والی صف میں، حتیٰ کہ سب سے پچھلی قطار میں۔ آخری آدمی کا رجز، ایک سوال، انی کنت من الظلمین، استغاثہ اور اعلان نامہ کوئی دنیاوی افتخار نہ کبھی لکھ سکتا ہے اور نہ لکھنے کا سوچ سکتا ہے۔

افتخار عارف محبت کہیں یا نعت و منقبت........ عوام الناس ہی کی ملکیت ہیں۔ ان کی شاعری میں یہ خواہش جگہ جگہ نظر آتی ہے کہ قیامت میں عام عوام الناس میں سے اٹھائے جائیں۔

افتخار عارف ایک انسائیکلوپیڈیائی دل و دماغ رکھتے ہیں۔ ایسے عالم لوگ اس خطے میں چند ہی ہونگے۔ اور ان عالموں میں سے ایسے لوگ تو بہت ہی کم ہونگے جن کی گردن پر سے انکساری کا

پرندہ اُڑ نہ چکا ہو۔ افتخار اُن چند عالموں میں سے ایک ہیں۔

اشفاق حسین

افتخار عارف کی شاعری میں جا بجا بکھرے ہوئے مذہبی استعاروں سے تو سب ہی واقف تھے لیکن ان کے اسٹائل اور شاندار طرزِ زندگی کے سبب جو انہیں اس وقت ''بی سی سی آئی'' کے ایک اعلیٰ عہدیدار، ٹی وی کی ایک اہم شخصیت اور ایک مقبول شاعر کی حیثیت سے حاصل تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کو شاید یہ خیال تک نہ آتا ہوگا کہ اس خوش لباسی اور ہنستے مسکراتے چہرے کے پیچھے کوئی ایسا پیوند بھرا پیراہن بھی ہے جو فقیروں اور درویشوں ہی کے بدن پر سجتا ہے۔ میری طرح کچھ اور بھی ایسے لوگ تھے جنہیں اُس وقت تک ان کے بہت زیادہ قریب رہنے کا موقع نہیں ملا تھا وہ بھی غالباً اس خیال کے تھے کہ افتخار کا یہ مذہبی رویہّ اور صوفیانہ انداز صرف شاعری برائے شاعری کے دائرے تک ہی محدود ہے اور اس کا تعلق زندگی کے اصل دھاروں سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تاثر اس گفتگو سے اور بھی ملتا تھا کہ جو اُن کی صحبت میں اکثر و بیشتر ہوا کرتی تھی۔ وہ محفل یاراں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو اس مقولے پر عمل کرتے ہیں کہ جان اگر جاتی ہے تو جائے مگر کوئی جملہ بیکار نہ جائے۔ مجھے اُس وقت تک ان کے ساتھ جن محفلوں میں اُٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا، عموماً ان محفلوں میں موسیقی، کتابوں، فلموں، کرکٹ، سیاست اور زیادہ تر شعر و ادب کا ہی چرچا رہا کرتا تھا۔ لاس اینجلس کی اُس صبح مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میرا تو اس عابدِ شب زندہ دار اور اوّل وقت نمازِ صبح پڑھنے والے افتخار عارف سے مکمل تعارف ہی نہیں تھا۔ شاید اسی لیے یہ مثل مشہور ہے کہ اگر کسی کو پرکھنا ہو تو اُس کے ساتھ سفر کرو۔ مجھ پر بھی اس سفر کے دوران بہت سا وقت ایک ساتھ گزارنے ہی کی بنا پر افتخار عارف کی شخصیت کے بہت سے گوشے منکشف ہوئے۔ ایسا صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ افتخار عارف کے حوالے سے کچھ اور لوگوں کو بھی مختلف موقعوں پر اس سے ملتی جلتی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ایاز گل

ایک دو سال پہلے تک میں ''افتخار عارف صاحب کو صرف ایک اُچھے شاعر یا پھر اُن کے مشہور ٹی وی پروگرام ''کسوٹی'' کی نسبت سے ہی جانتا تھا۔ یقیناً انہیں جاننے کے لیے یہ دو حوالے بھی بہت معتبر تھے۔ لیکن جب اکادمی ادبیات پاکستان میں اُن کی چیئرمین شپ کی اَیا مکاری میں اُن سے دو چار ملاقاتیں ہوئیں، تو ان ملاقاتوں نے اُن سے نیاز مندی اور تعلق کا ایک نیا رشتہ استوار کر دیا جو یقیناً اُنہیں جاننے والے حوالے سے کہیں زیادہ مضبوط و معتبر تھا۔

افتخار عارف صاحب کی اور اُن کے بارے میں لکھی ہوئی کتابیں زیرِ مطالع آئیں تو وہ ایک ہمہ جہت تخلیقات کی حیثیت سے ذہن پر چھا گئے اور جب اُن کی مہمانداری میں اُن سے مل بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا تو وہ دل میں عہد کر گئے۔

اُن کا اَچھا شاعر ہونا یقیناً باعث افتخار ہے اور اُس سے بڑھ کر ان کا اچھا انسان ہونا عارف افتخار ہے۔

ڈاکٹر محمد اعظم اعظم

افتخار عارف کا نام بجا طور پر دورِ جدید کے ان نمائندہ شاعروں میں شامل ہے جن کی اُردو ادب میں گذشتہ نصف صدی میں ایک منفرد مقام اور نمایاں پہچان ہے۔ 1970-1980 کے درمیانی عرصہ میں افتخار عارف ایک نئی سوچ، پختہ عصری شعور، بے مثال فکری تنظیم اور ایک منفرد لب و لہجہ کے ساتھ اقلیم ادب کی سرحدوں میں ایک جداگانہ انداز اور پیرائے کے ساتھ یوں داخل ہوئے کہ ان کے اشعار اور افکار کا دبدبہ عام و خاص پر، محسوس اور غیر محسوس طریقے سے چھا گیا اور تا دم آخر چھاتا رہا اپنے عہد کی اردو شاعری کے چند بہت ہی قد آور شعراء کی صف میں موجودگی کا احساس دلانا عارف کے فن کا افتخار بھی ہے اور اعتراف بھی۔

اپنی کم علمی کے باوجود میرے لیے یہ دعویٰ کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ افتخار عارف کے شعری

اور ادبی کامرانیوں میں ان کے بے پناہ شعری اور ادبی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے عمیق مطالعے کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ جس نوجوان افتخار عارف نے اپنی بے پناہ ذہانت اور علمیت کے مظاہرے کا آغاز کیا اسی ذوق وشوق نے انہیں ایک تسلسل اور باقاعدگی کے ساتھ کتابوں کی دنیا سے منسلک کیے رکھا۔ مشرق ومغرب کے جملہ جدید اصناف ادب کے مطالعے کی چھاپ جابجا ان کے شعری اور نثری تحریروں کی ثبت نظر آتی ہے۔

بطور انسان افتخار عارف کی دلکش شخصیت میں جمال وجلال کی مشترک جھلکیاں ساتھ ساتھ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کی شخصیت کی بے پناہ خوبیاں، پیار، محبت کے دلکش انداز دوست پروری، حق گوئی مروت اور ملنساری کے رویے قابل دید بھی اور قابل داد بھی۔

اپنے پیارے اور مہربان دوست، بین الاقوامی سطح کی قد آور شاعر اور ملک کے بلند پایہ عالم اور دانش افتخار عارف کی بھاری بھر کی شخصیت کے بارے میں اپنے ان مختصر تاثرات حضرات اقبال کے اس شعر کو نا مناسب سمجھنا کہ

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ادل سومرو

افتخار عارف بلاشبہ عہد حاضر کے ایک باکمال شاعر ہیں ان کی شاعری قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی بھرپور کشش رکھتی ہے۔ شعراء کی فہرست میں انہیں کوئی نمبر دینے کے بجائے میں یہ کہوں گا کہ وہ ایک منفرد لب ولہجے کے شاعر ہیں اور اپنی ایک علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ ابتدا سے لے کر جب تک ان کا تخلیقی سفر کہیں رکھا نہیں اس لیے ان کا قاری سے رابطہ منقطع نہیں ہوا ہے۔ فنی اور فکری توازن کی وجہ سے ان کی شاعری ہم جب بھی پڑھتے ہیں تو ہمیں تازگی کا احساس دلاتی ہے۔ کربلا کے استعارے سے لے کر جدید دور کی تشبیہات تک ان کا اپنا ایک علیحدہ انداز ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

افتخار عارف کا شمار عصر حاضر کے معتبر اور مستند شاعروں میں ہوتا ہے۔ اگر چہ وہ ازراہِ انکسار اپنے آپ کو بارواں کھلاڑی قرار دیتے ہیں لیکن در حقیقت وہ کھیل کی ابتدا کرنے والوں میں سے ہیں۔ افتخار عارف نے شعر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے، بڑی خوبصورت نظمیں، نعتیں اور منقبتیں بھی لکھی ہیں جن سے ان کے قلب کی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے لیکن ان کا اصل میدان غزل ہے۔ انہوں نے عصر حاضر کی غزل میں جو مقام حاصل کرلیا ہے وہ کسی بھی فنکار کے لیے باعث فخر ہوسکتا ہے۔

افتخار عارف نے زندگی کے کرب، پیچیدگی، بوقلمونی اور سفا کی کو جس طرح محسوس کیا اور غزل کے خوبصورت پیرائے میں ڈھال لیا اس سے آج کے دور کی تمام خوبیاں اور خرابیاں ہر پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہیں اور ان کی غزلوں کا قاری یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جاایں جاست۔

افتخار عارف کو زبان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے ان کی غزل کا لفظیاتی پیکر بڑا سجا ہوا ہے، اس میں پرانے اساتذہ کی پرکشش قدرتِ کلام کے ساتھ ساتھ نئے مزاج کی سادگی بانکپن بھی ملتا ہے۔

افتخار عارف نے آج کے دور کی کشمکش اور شان وشوکت کو اس دعا کے ساتھ پیرائے میں بیان کیا ہے کہ یاالٰہی میرے مکان کو گھر بنادے۔

ان کی شاعری بالخصوص ان کی غزل مکان کے کھوکھلے کروفر سے گھر کی سادگی تک سفر کی بڑی اثر انگیز داستان ہے۔ یہ داستان ابھی جاری ہے اور ابھی اس داستان سے نہ جانے کتنے پہلو نمایاں ہونگے۔

افتخار عارف کی شخصیت اور فن پر تحقیق

مقالات

افتخار عارف ...... فن اور شخصیت

(مقالہ برائے ایم اے اردو): جامعہ کراچی: ۱۹۹۸ء ص:۱۴۱

نرگس گل ملک

افتخار عارف کی شاعری کا فکری و فنی تجزیہ

(مقالہ برائے ایم اے اردو): بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان: ۱۹۹۸ء ص:۲۸۲

لیاقت علی

افتخار عارف بہ حیثیتِ شاعر

(مقالہ برائے ایم اے اردو): اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور: ۱۹۹۸ء ص:۸۸

عائزہ قریشی

افتخار عارف کی شاعری

(مقالہ برائے ایم اے اردو): گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور: ۲۰۰۴ء ص:۲۲۱

شاہ نواز چودھری

افتخار عارف کی شاعری کے فکری رجحانات......

تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(مقالہ برائے ایم فل اردو): گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد: ۲۰۰۸ء ص: ۲۲۴

زینت افشاں

دینی روایات اور افتخار عارف کی شاعری

(مقالہ برائے ایم فل اردو): علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد: زیرِ تحقیق

محمود عالم گیلانی

افتخار عارف پر لکھی گئی،
کتب اور رسائل نمبر

جوازِ افتخار

(افتخار عارف: فن و شخصیت) مرتبہ: شیما مجید

لاہور، عبارات: ۲۰۰۰ء/ راولپنڈی، نواب سنز پبلی کیشنز: ۲۰۰۵ء: ۳۵۶+۴۱ص

اقلیمِ ہنر

(افتخار عارف: شخصیت و فن) : رؤف امیر لاہور، الوقار پبلی کیشنز: ۲۰۰۳ء: ۲۴۴ص

جہانِ افتخار

زینت افشاں:

اسلام آباد، پورب اکادمی: جون ۲۰۰۹ء: ۲۳۰ص

عہد ساز شاعر...... افتخار عارف

عائزہ قریشی

لاہور، الفیصل: اگست ۲۰۰۳ء: ۱۳۶ص

رسائل

ماہ نامہ "چہار سو"

(افتخار عارف نمبر)، راول پنڈی: جولائی/اگست ۱۹۹۵ء

سہ ماہی "شعر و سخن"

(افتخار عارف نمبر)، مانسہرہ: جون تا اگست ۲۰۰۷ء

حوالے

۱۔ رؤف امیر: اقلیمِ ہنر (افتخار عارف: شخصیت و فن): لاہور، الوقار پبلی کیشنز: ۲۰۰۳ء: ص ۱۵

۲۔ اقلیمِ ہنر: ص ۱۶

۳۔ زینت افشاں: افتخار عارف کی شاعری کے فکری رجحانات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل اردو): ص ۱۰

۴۔ محمد اقبال جوئیہ: افتخار عارف سے خصوصی انٹرویو مشمولہ سہ ماہی تاریخ ساز انٹرنیشنل، گوجرانوالہ: ۲۰۰۶ء: ص ۷۹

۵۔ زینت افشاں: افتخار عارف کی شاعری کے فکری رجحانات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل اردو): فیصل آباد، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی: ۲۰۰۸ء: ص ۲

۶۔ آصف مالک: انٹرویو: سنڈے ایکسپریس: ۷۔ جنوری ۲۰۰۷ء: ص ۴

۷۔ شیراز بن عطا: افتخار عارف سے بات چیت مشمولہ وژن مجلہ اسلام آباد ماڈل کالج ۳۔ برائے طلبہ، جی۔۱۰/۳، اسلام آباد: ۲۰۰۶ء: ص ۱۹

۸۔ لیاقت علی: افتخار عارف کی شاعری کا فکری و فنی تجزیہ (مقالہ برائے ایم اے اردو): ملتان، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی: ۱۹۹۱ء: ص ۳۔۴

۹۔ براہِ راست مشمولہ جوازِ افتخار: ص ۳۱۴۔۳۱۵

۱۰۔ ایضاً: ص ۳۱۵۔۳۱۶

۱۱۔ ایضاً: ص ۳۱۷

۱۲۔ (لیاقت علی: افتخار عارف کی شاعری کا فکری و فنی تجزیہ (مقالہ برائے ایم اے اردو ص: ۶

۱۳۔ شاہنواز چوہدری: افتخار عارف کی شاعری۔ مقالہ برائے ایم اے اردو: ص ۸

۱۴۔ لیاقت علی: افتخار عارف کی شاعری کا فکری و فنی تجزیہ (مقالہ برائے ایم اے اردو: ص ۶

۱۵۔ شاہنواز چوہدری: افتخار عارف کی شاعری۔ (مقالہ برائے ایم اے اردو): ص ۱۱

۱۶۔ زینت افشاں: افتخار عارف کی شاعری کے فکری رجحانات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، (مقالہ برائے ایم فل اردو): ص ۵

۱۷۔ ایضاً:ص ۵۔۶

۱۸۔ ایضاً:ص۶

۱۹۔ شاہنواز چوہدری:افتخار عارف کی شاعری۔(مقالہ برائے ایم اے اردو):ص ۱۱

۲۰۔ ایضاً:ص۱۹

۲۱۔ اقلیمِ ہنر:ص۲۳

۲۲۔ ایضاً:ص۳۲۴

۲۳۔ شمع زیدی:افتخار عارف سے ایک ملاقات مشمولہ جوازِ افتخار:ص۳۵۳

۲۴۔ ایضاً:ص۳۵۳

۲۵۔ براہِ راست مشمولہ جوازِ افتخار:ص۳۱۸

۲۶۔ سنڈے ایکسپریس:ص۴

۲۷۔ ایضاً:ص۳۱۹

۲۸۔ لیاقت علی:افتخار عارف کی شاعری کافکری و فنی تجزیہ
(مقالہ برائے ایم اے اردو)ص:۳۷

۲۹۔ جہانِ افتخار۔افتخار عارف شخص اور شاعر۔زینت افشاں،ص:۴۵

۳۰۔ شاہنواز چوہدری:افتخار عارف کی شاعری۔(مقالہ برائے ایم اے اردو)ایضاً:ص۱۴

۳۱۔ زینت افشاں:افتخار عارف کی شاعری کے فکری رجحانات:تحقیقی وتنقیدی جائزہ،
(مقالہ برائے ایم فل اردوص:۳۷

۳۲۔ ارقم مجلّہ دارارقم ماڈل کالج،راولاکوٹ:۲۰۰۸ء:ص۶۲۔۶۱

۳۳۔ افتخار عارف سے بارش میں باتیں:جوازِ افتخار:ص۳۰۹

۳۴۔ ایضاً:ص۳۱۸

۳۵۔ ایضاً:ص۳۱۸

۳۶۔ افتخار عارف سے بارش میں باتیں مشمولہ جوازِ افتخار:ص۳۰۹

۳۷۔ افتخار عارف سے بات چیت:وژن:ص۲۰

۳۸۔ براہِ راست:جوازِ افتخار:ص۳۲۰

۳۹۔ ایضاً:ص۳۲۰

۴۰۔ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ:افتخار عارف سے مکالمہ:سہ ماہی شعر و سخن (افتخار عارف نمبر)،مانسہرہ:جون تا اگست ۲۰۰۷ء:ص ۴۷

۴۱۔ احمد ندیم قاسمی:رائے:وزیٹر بک اردو مرکز لندن مملوکہ افتخار عارف

۴۲۔ قدرت اللہ شہاب:رائے:ایضاً

۴۳۔ راشد حمید:مکالمہ نما:گوجرانوالہ،فروغ ادب اکادمی:اوّل ۱۹۹۹ء:ص۱۴

۴۴۔ اختر علی اختر: افتخار عارف کی کہی؛ ان کہی: جنگ سنڈے میگزین: ۱۳۔ جولائی ۲۰۰۸ء: ص ۱۱
۴۵۔ ظہور الاسلام جاوید: رائے مشمولہ مجلّہ بزمِ نشور (خصوصی ایڈیشن)، کراچی: ۲۰۰۶ء
۴۶۔ طاہر مسعود: افتخار عارف......ایک نہتا اور اکیلا آدمی مشمولہ جوازِ افتخار: ص ۲۹۸
۴۷۔ خواجہ رضی حیدر: افتخار عارف سے میری پہلی ملاقات مشمولہ مجلّہ بزمِ نشور، کراچی
۴۸۔ ممتاز مفتی: تخلیق کار مشمولہ جوازِ افتخار: ص ۳۰
۴۹۔ ایضاً: ص ۳۲۔۳۱
۵۰۔ قمر جمیل: رائے مشمولہ مجلّہ بزمِ نشور، کراچی
۵۱۔ انتظار حسین: افتخار عارف......ایک تأثر مشمولہ پین پاکستان لٹریری جرنل: دسمبر ۲۰۰۷ء: ص ۴۱۔۴۲
۵۲۔ ضمیر جعفری: دو قلعوں کا شاعر مشمولہ جوازِ افتخار: ۴۶۔۴۷
۵۳۔ عطاء الحق قاسمی: افتخار عارف مشمولہ جواز افتخار: ص ۲۱۰۔۲۱۱
۵۴۔ شاہد حنائی: چہرہ نما: کراچی، اکادمی بازیافت: اوّل ستمبر ۲۰۰۱ء: ص ۲۱
۵۵۔ متین فکری: افتخار عارف......قومی اعزاز اور شاعری مشمولہ جوازِ افتخار: ص ۲۷۵
۵۶۔ اشفاق حسین: پیش لفظ: شہرِ علمؑ کے دروازے پر: اسلام آباد، پورب اکادمی: اوّل جولائی ۲۰۰۶ء: ص ۱۵۔۱۶
۵۷۔ حسینہ معین: افتخار عارف مشمولہ جوازِ افتخار: ص ۳۳۲
۵۸۔ ایضاً: ص ۳۳۴
۵۹۔ شمع زیدی: افتخار عارف سے ایک ملاقات مشمولہ جوازِ افتخار: ص ۳۵۱
۶۰۔ ممتاز مفتی: تخلیق کار مشمولہ جوازِ افتخار: ص ۳۴
۶۱۔ حکیم سرور سہارن پوری: افتخار عارف......شخصیت اور فن مشمولہ ماہ نامہ سیارہ، لاہور: سال نامہ ۲۰۰۷ء: ص ۴۲۴
۶۲۔ سخن ھائے آشنا: لاہور، مقبول اکیڈمی: اوّل ۲۰۰۳ء: ص ۹۔۱۰
۶۳۔ عبدالعزیز ساحر: بابا فریدؒ، اشلوک اور ارشد محمود ناشاد: اشلوک: لاہور، زاویہ پبلی کیشنز: اوّل ۱۹۹۹ء: ص ۱۲
۶۴۔ افتخار عارف کی شاعری: جوازِ افتخار: ص ۱۳۲
۶۵۔ Preface: The Twelfth Man: Brenda Walker: Karachi, Maktab-e-Danyal: pxiii
۶۶۔ ایک شاعر کا آدھا سورج: جوازِ افتخار: ص ۲۷۰
۶۷۔ افتخار عارف شعری شناخت کا حصہ......نئی معنیاتی جہات: جوازِ افتخار: ص ۱۳۴
۶۸۔ چُپ دریا: جوازِ افتخار: ص ۱۸۱
۶۹۔ ایضاً: ص ۱۸۰

۷۰۔ افتخار عارف: جوازِ افتخار: ص۲۱۷

۷۱۔ افتخار عارف کا کارنامۂ خاص: جوازِ افتخار: ۱۵۸

۷۲۔ مہرِ دونیم سے حرفِ باریاب تک: جوازِ افتخار: ص۵۸

۷۳۔ فلیپ: جوازِ افتخار

۷۴۔ حرفِ باریاب: جوازِ افتخار: ص۲۵۰

۷۵۔ سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ: لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز: ۱۹۸۸ء: ص۸۴

۷۶۔ افتخار عارف کا مجموعہ...... حرفِ باریاب: جوازِ افتخار: ص۱۹۵

۷۷۔ خرد اور خاک: ایضاً: ص۱۸۴

۷۸۔ آہنگ کی تلاش کا شاعر: ایضاً: ص۱۱۷

۷۹۔ خرد اور خاک: ایضاً: ص۱۸۹

۸۰۔ دو قلعوں کا شاعر: ایضاً: ص۴۵

۸۱۔ افتخار عارف کا کارنامۂ خاص: ایضاً: ص۱۶۲۔۱۶۳

۸۲۔ آہنگ کی تلاش کا شاعر: ایضاً: ص۱۱۸

۸۳۔ حرفِ باریاب کا مطالعہ: ایضاً: ص۲۹۵

۸۴۔ مہرِ دونیم: ایضاً: ص۲۰۶

۸۵۔ ایضاً: ص۲۰۶۔۲۰۷

۸۶۔ مہرِ دو نیم...... اردو شاعری میں ایک نیا باب: ایضاً: ص۱۵۰

۸۷۔ افتخار عارف کی شاعری: ایضاً: ص۲۳۵

۸۸۔ مہرِ دو نیم...... اردو شاعری میں ایک نیا باب: ایضاً: ص۱۴۹۔۱۵۰

۸۹۔ ایضاً: ص۱۵۱

۹۰۔ مکالمہ نما: ص۱۱

۹۱۔ اقلیمِ ہنر: ص۱۱۴

۹۲۔ واصف علی واصف...... ایک تاثر (غیر مطبوعہ مضمون): مملوکہ افتخار عارف

۹۳۔ ایضاً

۹۴۔ مشتاق احمد یوسفی: (غیر مطبوعہ مضمون): مملوکہ افتخار عارف

۹۵۔ اقلیمِ ہنر: ص۴۵

۹۶۔ بنام پروفیسر انیس اشفاق: ۲۴۔ اگست ۲۰۰۶ء

۹۷۔ بنام اقبال مجید: ۱۵۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء

۹۸۔ خطوط نگاری: اردو ادب کی فنی تاریخ مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری: لاہور، الوقار پبلی کیشنز: ۲۰۰۳ء: ص۳۹۷

کتابیات

افتخار عارف کی کتابیں

۱۔ مہرِ دو نیم: کراچی، مکتبہ دانیال: ۲۰۰۳ء

۲۔ حرفِ باریاب: کراچی، مکتبہ دانیال: ۲۰۰۵ء

۳۔ جہانِ معلوم: کراچی، مکتبہ دانیال: ۲۰۰۵ء

۴۔ شہرِ علمؑ کے دروازے پر: اسلام آباد، پورب اکادمی: اوّل جولائی ۲۰۰۶ء

۵۔ کتابِ دل و دنیا: کراچی، مکتبہ دانیال: ۲۰۰۹ء

۶۔ The Twelfth Man: Brenda Walker:Karachi, Maktab-e-Danya

ثانوی مآخذ

۱۔ ارشد محمود ناشاد: اشلوک: لاہور، زاویہ پبلی کیشنز: اوّل ۱۹۹۹ء

۲۔ راشد حمید: مکالمہ نما: گوجرانوالہ، فروغ ادب اکادمی: اوّل ۱۹۹۹ء

۳۔ رؤف امیر: اقلیمِ ہنر (افتخار عارف: شخصیت وفن): لاہور، الوقار پبلی کیشنز: ۲۰۰۳ء

۴۔ زینت افشاں: افتخار عارف کی شاعری کے فکری رجحانات: تحقیقی و تنقیدی جائزہ (مقالہ برائے ایم فل اردو): فیصل آباد، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی: ۲۰۰۸ء

۵۔ شاہد حنائی: چھرہ نما: کراچی، اکادمی بازیافت: اوّل ستمبر ۲۰۰۱ء

۶۔ شیما مجید (مرتبہ) جوازِ افتخار (افتخار عارف: فن وشخصیت): راول پنڈی، نواب سنز پبلی کیشنز: ۲۰۰۵ء

۷۔ فائزہ قریشی: افتخار عارف بہ حیثیت شاعر (مقالہ برائے ایم اے اردو) بہاول پور، اسلامیہ یونی ورسٹی: ۱۹۹۸ء

۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (مرتبہ): اردو ادب کی فنی تاریخ: لاہور، الوقار پبلی کیشنز: ۲۰۰۳ء

۹۔ عبدالعزیز خالد: سخن ھائے آشنا: لاہور، مقبول اکیڈمی: اوّل ۲۰۰۳ء

۱۰۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر: سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ: لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز: ۱۹۸۸ء

۱۱۔ لیاقت علی: افتخار عارف کی شاعری کا فکری و فنی تجزیہ (مقالہ برائے ایم اے اردو): ملتان، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی: ۱۹۹۱ء

۱۲۔ شاہنواز چوہدری: افتخار عارف کی شاعری۔ (مقالہ برائے ایم اے اردو)۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور،)

۱۳۔ جہانِ افتخار۔ افتخار عارف شخص اور شاعر۔ زینت افشاں، ص: ۴۵

رسائل و جرائد

۱۔ ارقم مجلّہ دارارقم ماڈل کالج، راولاکوٹ: ۲۰۰۸ء

۲۔ سہ ماہی تاریخ ساز انٹرنیشنل، گوجرانوالہ: ۲۰۰۶ء

۳۔ پین پاکستان لٹریری جرنل: دسمبر ۲۰۰۷ء:

۴۔ جنگ سنڈے میگزین: ۱۳۔ جولائی ۲۰۰۸ء

۵۔ سنڈے ایکسپریس: ۷۔ جنوری ۲۰۰۷ء

۶۔ ماہ نامہ سیارہ، لاہور: سال نامہ ۲۰۰۷ء

۷۔ سہ ماہی شعر و سخن (افتخار عارف نمبر)، مانسہرہ: جون تا اگست ۲۰۰۷ء

۸۔ مجلّہ بزمِ نشور (خصوصی ایڈیشن)، کراچی: ۲۰۰۶ء

۹۔ وژن مجلّہ اسلام آباد ماڈل کالج ۳۔ برائے طلبہ، جی۔ ۱۰/۳، اسلام آباد: ۲۰۰۶ء

قلمی دستاویزات

۱۔ افتخار عارف کے قلمی مضامین رخطبات

۲۔ افتخار عارف کے خطوط

۳۔ وزیٹر بک اردو مرکز لندن مملوکہ افتخار عارف

اشارات شخصیات